غزلیں، نظمیں

نیاز بدایونی

سول ایجنٹس: کراچی بک ڈپو
۴۸ ۔ اردو بازار ۔ کراچی

شفیع سنز بک سیلرز
۱۰۹ گول ایمپریس مارکٹ ۔ کراچی

قیمت:- ۱۸ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحضورِ سرورِ کائناتؐ

حیات ان کے در تک ہی طول سفر ہے
یہ قصّہ پھر آگے بہت مختصر ہے

خلاؤں کے مجروحِ پرواز شاہیں
حرم کی طرف عزّت یال و پر ہے

پھٹے پیرہن سے بھی برسے ہے خوشبو
محمدؐ کا دیوانہ، دیوانہ گر ہے

بڑا فائدہ نعت گوئیؑ سے پہونچا
نظر میری آج اپنے اعمال پر ہے

اپنی "امّی"

کے

نام

جو

شاعر کی بیٹی

شاعر کی بیوی

اور

شاعر کی ماں

ہیں۔

نیاز

یادداشت

تم نے کہا تھا ______

"نیاز! تمہارا مجموعۂ کلام تو

میرے سینہ سے لگا رہے گا"

جذباتی باتیں کون یاد رکھتا ہے

لیکن نہ جانے کیوں

آج اپنے مجموعہ کی اشاعت پر

تمہاری یہ بات مجھے یاد آگئی!

ترتیب

غزلیں

نظمیں

پہروں تو گماں یہ گذرے گا دیکھا ہے مگر دیکھا ہے کہاں
تکتے ہی رہیں گے چہروں کو ہم لوگ جو بچھڑ اِک بار ملے

نیاز بدایونی

Scanned by CamScanner

آئینہ سے آئینہ خانہ تک

نیازؔ کے فکری سفر کے پس منظر اور ارتقاء کا مختصر جائزہ

از: جنابِ دلاور فگار

اس کے لہجہ کو نہ کیوں حاصل ہو رنگِ امتیاز — خاندانی شاعروں میں ہے مرا بھائی نیازؔ
رشکِ دہلی ہے نہ وہ فخرِ مراد آباد ہے — شادؔ صدیقی کا پوتا آبروئے شادؔ ہے
اس پہ حیرت کیا اگر رنگ اُسکا دل آویز ہے — اُس کو نسبت اُس زمیں سے ہے جو مردم خیز ہے
اُس کا فن پہچانا جاتا ہے بلالی چھاپ سے — فن کی دولت اُس کو ورثہ میں ملی ہے باپ سے
ہر طرح نامِ بدایوں قابلِ تحسین ہے — کیوں نہ ہو یہ شہرِ محبوبِ نظام الدینؒ ہے
دورِ فانیؔ تھا بدایوں کی خوش اقبالی کا دَور — جامیؔ و شادؔ و قمرؔ کا جوہرؔ و عالیؔ کا دَور
شادؔ کے ہوتے ہی رخصت دن جو گذرے عیش کے — اب کریڈٹ ہوگیا رائج بجائے کیش کے
بزم میں اب خشترؔ و انجمؔ تھے یا فوقؔ و شکیلؔ — جامؔ صاحب تھے اور اُن کا زورِ پروازِ تخیل
اوجؔ و رعناؔ بھی یہاں میدان میں تھے جوشؔ بھی — شاعری حسنِ نظر بھی تھی نشاط گوش بھی
شعر محفل میں سنے جاتے تھے اب گانے کے ساتھ — گیس کا ہنڈا اہمی کرتا تھا پروانے کے ساتھ
بزمِ جامیؔ کی صدارت جب سے رونقؔ کو ملی — کر گئی قطرے کو دریا آپ کی دریا دلی
بزمِ جامیؔ کے مقابل تھے اب احبابِ شکیلؔ — طرح کے مصرعہ پہ لڑتے تھے یہ مرغانِ اصیل
جوشؔ کے گھر محفلیں جمتی تھیں ساری ساری رات — رات کے دو دو بجے تک فاعلاتن فاعلات
اپنا اک حلقہ بنائے تھے الگ سب سے پیامؔ — با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام
ضمن میں الیاسؔ کے اشعار کا چھڑکاؤ تھا — ہر سینچر کو نئی گلی بڑا نادؔ داؤ تھا
گولہ باری ہو رہی تھی جب یہاں ہر رات میں — فیلڈ میں کود ے نیازؔ ایسے ہی کچھ حالات میں
تھے عروجؔ خوش بیاں کے ساتھ غازیؔ او رنیازؔ — باز کے ہمراہ اُڑتے تھے یہ شاہیں اور باز
بھائی افضالؔ اس زمانہ میں غزل پر لوٹ تھے — ان دنوں وہ 'شیروانی' کے بجائے کوٹ تھے
آنکھ جس تہذیب میں کھولی ہے میرے بھائی نے — اپنے اسکی شاعری میں جڑ دیئے ہیں آئینے
روشنی جس کو ملی تھی شادؔ کے دیوان سے — اسکے لہجہ میں نکھار آیا ہے پاکستان سے
پیڑ کی جڑ ہم نے یہ مانا کہ اسکے ساتھ ہے — ارتقاء میں اسکے پاکستان کا بھی ہاتھ ہے
جڑ کسی پودے کو رنگ اور روپ دے سکتی نہیں — کھاد دے سکتی ہے لیکن دھوپ دے سکتی نہیں
یہ بھی دیکھیں وہ محقق جڑ پہ ہے جنکی نظر — کس گلستاں کی فضاؤں میں پلا ہے یہ شجر

ایک دن میں کب یہ شاعر فن کا دیوانہ ہوا
"پہلے آئینہ بنا پھر آئینہ خانہ ہوا"

ذات کا ذکر

جناب افضال احمد

شعر کہنا نیازؔ کی مجبوری تھی، آخر اُسی بدایوں کے فرزند ہیں کہ جہاں بقول شخصے ڈھیلا اُٹھاؤ تو اُس کے نیچے سے دو اشخاص برآمد ہوں گے۔ ایک شعر پڑھتا ہوا، دوسرا داد دیتا ہوا۔ ایسے میں نیازؔ بدایونی منہ کھولتے ہی شعر نہ کہتے تو کیا "آغوں" کہتے؟ پھر ان کی خاندانی فضاؤں میں گھلا ہوا شعر پرورش، دیوانے اور ہو والی بات ہوئی۔

والد صاحب قبلہ کے نانا حضرت انصار حسین زلالیؔ تھے، جید شاعر، مولانا حالیؔ کے شاگرد، مرزا غالبؔ سے بھی خط و کتابت رہی تھی۔ خاندان کے ایک اور بزرگ حضرت عیشؔ، حضرت امیر مینائیؔ کے شاگرد تھے۔ علامہ سبطین احمد بھی اس خاندان کے ایک مقتدر بزرگ تھے۔ جناب حسرتؔ بدایونی مرحوم پھوپا تھے، حضرت منورؔ بدایونی رشتہ کے تایا ہیں اور حضرت محشرؔ بدایونی رشتہ کے چچا۔ جناب دلاور فگارؔ بھی قریبی عزیز ہیں جو آج طنز و مزاح میں "اکبر ثانی" ہیں۔ کبھی غزل گو بھی قیامت کے تھے۔ قاضی رضی الاسلام وصلؔ نیازؔ کے نانا تھے۔ ہائے ان کا کیا شعر یاد آیا ؎

ہے محبت سے آدمی مجبور یہ خطا جان کر نہیں ہوتی

اور ان سب پر مستزاد، نیازؔ کے دادا صاحب قبلہ حضرت اکرام احمد شادؔ، حضرت احسنؔ مارہروی کے شاگرد رشید تھے۔ اساتذہ فن

ہیں شمار کیے جاتے تھے۔ اُن کا ایک مختصر مجموعۂ کلام "نغماتِ شاد"
کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ نیاز کے
والد مولوی سلمان احمد اپنے شہر کے ممتاز ایڈوکیٹ ہیں۔
ہلالی تخلص ہے۔ اُن کے دو نعتیہ مجموعے 'بارشِ رحمت'
اور 'باران رحمت' شائع ہوئے ہیں۔ ان مجموعوں سے بیشتر
ان کی ایک تصنیف "شرع محمدی منظوم" بھی شائع ہو چکی ہے
چنانچہ اب آپ ہی بتایئے کیا شعر کہنا نیاز کی مجبوری
نہ تھی ۔؟

بحیثیت شاعر ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان ہی نیاز
غوں غاں کرنے لگے تھے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۴ء کے درمیان
باقاعدہ شاعر بن گئے مگر شعر پوری روایت داری کے ساتھ
کہنے کے باوجود ایک بدعت کی۔ کسی سے باقاعدہ شرف تلمذ
حاصل نہیں کیا۔ ظاہر ہے بُری صحبت ہی اس بے استادے پن
والی بے راہ روی کا سبب ہو سکتی تھی اور یہ بُری صحبت
راقم الحروف نے فراہم کی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ
نیاز نے شعر کے سلسلہ میں کسی سے کچھ سیکھا ہی نہیں۔
یہاں دادا کی اُنگلی بہت کام آئی کہ اُسے پکڑ کر عروض کے
کئی مرحلے شروع میں ہی آسانی سے سر کر لئے لیکن کہلائے
پھر بھی "بے استادے" جائیں گے واضح ہو کہ بدایوں کی
مشاعرہ بازی کی روایت میں یہ ایک نہایت مغلظ گالی ہے۔

نیاز احمد ۱۹۳۴ء کے اپریل میں کسی دن مدینۃ الاولیاء
بدایوں میں پیدا ہوئے۔ پہلوٹا تھے جتنے عزیز نہ ہوتے کم تھا۔

سوئے اتفاق کہ ان کی پیدائش سے چند دن پہلے ان کے چچا مصاحب حسین کا عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا چنانچہ دادا نے نومولود کو اپنے غم کا مداوا سمجھا اور نیاز ماں باپ سے زیادہ، دادا کے دلارے، آنکھ کے تارے ہو گئے۔ دادا کو پوتے سے اور پوتے کو دادا سے جو والہانہ لگاؤ تھا، اُس کی تصویر نیاز نے اپنی تالیف "غمِ فروزاں" میں پیش کی ہے جو مولانا شاذ کے انتقال پر ۱۹۶۴ء میں مکتبۂ پرچم کراچی نے شائع کی تھی۔

ذرا بڑے ہوئے تو ایک یادگار جشن مکتب سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ یہ سفر مشن اسکول سے اسلامیہ اسکول اور حافظ صدیق اسلامیہ کالج ہوتا ہوا بریلی کالج (آگرہ یونیورسٹی) پر تمام ہوا۔ بدایوں بھر کی روایات کے خلاف مگر خاندان کی اپنی روایات کے عین مطابق یہ علی گڑھ یونیورسٹی کی بجائے بریلی کالج بھیجے گئے۔ ان کے والد نے بھی وہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ پروفیسر تسنیم صدیقی اور ڈاکٹر داس گپتا، باپ بیٹے دونوں استاد رہے تھے۔ جس وقت راقم الحروف نے ہندوستان کو الوداع کہا تو نیاز بریلی کالج میں ایم اے (اردو) سالِ اوّل کے طالب علم تھے اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر تسنیم صدیقی (مرحوم) کے اس قدر چہیتے شاگرد کہ انھوں نے اپنے نام پرائیویٹ طلبا کی جانب سے آنے والے نصابی اور درسی استفسارات پر مشتمل اکثر خطوط کے جوابات دینے کی عزت بھی نیاز کو عطا کر رکھی تھی۔

اپنے اسکول اور کالج کے زمانہ میں نیازؔ نے غیر نصابی مشاغل کے بطور تقریری مقابلوں میں بھی حصّہ لیا، مقامی، صوبائی اور کُل ہند مباحثوں اور مذاکروں میں کتنے ہی انعامات پائے۔ انجمن سازی بھی کی، پہلے خود صدر اور سکریٹری منتخب ہوتے رہے پھر منڈیر کے پہلوان بن کر دوسروں کو انتخاب جیتنے کے گر بتایا کئے۔ اسکول اور کالج میگزین کی ایڈیٹری کا شرف بھی پایا اور وہ جو درسگاہوں میں کچھ منتخب طلبا کو نظم وضبط کا ٹھیکیدار المعروف بہ "پراکٹر" بنا دیا جاتا ہے سو نیازؔ کو مستقلاً یہ منصب بھی حاصل رہا لیکن اظہارِ طبعیت کا اصل میدان شعر گوئی اور صرف شعر گوئی ٹھہرا۔

بداؤں (کہ اصل نام یہی ہے) کے محلہ سوتھ کی گلی "پیٹری تلہ" تھی تو نہایت چھوٹی سی گلی لیکن تھی خطۂ یونان۔ نیازؔ کی آبائی حویلی 'شاد منزل' کے عقبی حصے میں ایک مستطیل نما کمرہ نیازؔ کی نشست گاہ تھا۔ اس کمرہ کا دروازہ مذکورہ گلی میں کھلتا تھا۔ اس گلی میں سید فرخ جلالی رہتے تھے جو اپنے علمی شغف، سنجیدہ مزاجی اور قلندری کے سبب نوجوانی ہی سے "چچا فرخ" کہلائے اور پھر علمی و ادبی سطح پر فرخ کنول بن کر ابھرے۔ اسی گلی میں سید بلال احمد بھی رہتے تھے، نہایت سعادت آثار اپنی امی کے بیٹے، ویسے باپ کا بھی ادب کرنے والے۔ یہی بلال احمد اب پاک فضائیہ میں ایک چوٹی کے افسر ہیں اور اب بھی خوب ہیں۔

یہی گلی پیٹری تلہ، نیازؔ کی گلی بھی تھی اور نیازؔ کی نیازمندیوں

کی بھی۔ اسی یونان نہاد گلی میں ایک ہیلن بھی آبسی تھی ۔ کیا نام تھا اس ہیلن کا جو ٹرائے کے گھوڑے کی طرح کسی دل کے آنگن فتنے جگانے، قیامتیں بپا کرنے آبسی تھی — مگر جانے دیجئے، نام میں کیا دھرا ہے ۔ یوں بھی خوشبوؤں کو رُسوا نہیں کرنا چاہیئے۔ معاملہ یہ تھا کہ ایسے مقامات، شعور و فن کے ابتدائی مرحلہ سے گذرنے والے شاعر کے لئے خاصے خطرناک ہوتے ہیں، جو ٹھہر گیا وہ ٹھہر گیا، جو گزر گیا وہ گزر گیا والی بات ہوتی ہے ۔ اچّھا ہی ہوا کہ نیاز کے دیدۂ و دل نے کسی 'خوب تر' کی تلاش کا سفر جاری رکھا —— رہی یہ بات کہ وہ اس تلاش میں کہاں، کب اور کس حد تک کامیاب ہوئے تو نیاز کا سارا کلام آپ کے سامنے بکھرا پڑا ہے ۔ کچھ اندازے آپ بھی لگائیے —— پیڑی تلہ کا حال راقم الحروف کو اس لئے معلوم ہے کہ وہ خود ان دنوں اسی گلی میں رہا کرتا تھا۔ اور نیاز مندوں میں سے ایک تھا ۔

ذکر جس گلی کا ہے وہ اُس وقت شعر و ادب کا گہوارہ بنی ہوئی تھی ۔ یہاں شکیب جلالی (مرحوم) اور ظفر بودی آیا کرتے تھے ۔ محمد عمر آیا کرتے تھے کہ جو آج بھی نیاز کے عزیز ترین دوستوں میں سے ایک ہیں ۔ یہاں غازی آیا کرتے تھے ۔ یہاں عبداللہ ولی بخش اور قمر فرشوری کی محفل جما کرتی تھی ۔ یہ گلی تمیم صدیقی اور قدیر صدیقی کا تو دوسرا گھر ہی تھی ، نورالدین احمد (مرحوم) اخلاق اختر حمیدی ، ڈاکٹر ادیس صالح صدیقی اور جلیل فریدی بھی اس گلی کے لئے اجنبی نہ تھے ۔ یہاں ابوالفضل صدیقی،

سید عروج زیدی، ریاض فرشوری، رونق بدایونی اور کوکب جمیل بھی قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے۔

ان دنوں اس گلی پر سرخ انقلاب اور ترقی پسندی کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اور یہ نیاز کی مروت اور وضعداری تھی کہ وہ بدعنوں سے بے نیاز ہونے کے باوجود ہم ہی لوگوں میں شامل رہے اثر صرف اسی قدر قبول کیا کہ "بے استادے" نکل گئے۔ چند بعد نیاز بدایونی ملک بھر میں دور دور مشاعروں میں جانے لگے اور یہ سلسلہ پاکستان آنے تک جاری رہا۔ بھارت میں ان کا کلام "پگڈنڈی" امرتسر، "بیسویں صدی" دہلی، "مدینہ" بجنور، "نگارش" امرتسر، رہیل کھنڈ، بریلی اور "آئینہ" دہلی وغیرہ میں چھپتا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے چند لوگوں کا ذکرا در کرتا چلوں۔ ان میں پہلا نام نیاز کے چھوٹے بھائی، بھارت کے جانے پہچانے ادیب اور شاعر عرفان صدیقی کا ہے جو وہاں کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ انعام یافتہ شعری مجموعہ "کینوس" اور کئی تنقیدی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دوسرا نام اشفاق صدیقی کا ہے۔ یہ نیاز کے دوسرے چھوٹے بھائی ہیں، ادیب و شاعر نہیں مگر ادب و شعر نواز ضرور ہیں۔ شاعر اور ادیب شاید اس لئے نہ بن سکے کہ ادبیات کو نیاز اور عرفان کا حصہ سمجھ کر یہ ابتدا ہی سے کامرس کے مضامین کے گرویدہ رہے، تیسرے ہیں نیاز کے لنگوٹیا یار اور رشتہ کے ماموں خلیل صدیقی آجکل کراچی میں ایک تجارتی فرم کے مالک ہیں۔ خلیل صدیقی مقتدر

صحافی جناب ایم اے اخیار اور جناب ادریس صدیقی کے چھوٹے بھائی ہیں - یہ نیاز کا ننھیالی سلسلہ ہے -اس سلسلہ میں دو مزید شخصیات کا ذکر کرنا از بس ضروری ہے - ان میں پہلی شخصیت نیاز کے خالہ زاد بھائی جناب جاوید حسن علی (انکم ٹیکس سروسز) کی ہے جو میجر قاضی حامد علی مجازی کے صاحبزادے ہیں دوسری شخصیت آنسہ سیدہ عارفہ کی ہے -جو نیاز کی خالہ زاد بہن ہیں -حصولِ تعلیم کے دور میں ملک کی شعلہ نوا مقررہ تھیں اور پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے کے بعد ان دنوں امریکہ میں پی ایچ ڈی کی تکمیل میں مصروف ہیں -

چراغ سے چراغ جلتا ہے، تین حضرات اور ہیں کہ جن کا نام لئے بغیر ذکرِ نیاز مکمّل نہ ہوگا -ان میں پہلا نام جناب طیب ہاشمی کا ہے، ایسے عزیز کہ مع نیاز تمام عزیز اُن کے گرویدہ اور ایسے خاندان دوست کہ جمعرات کی شب کو جب تک چند عزیزوں کو جمع کر کے "شب قہقہہ" نہ سجالیں، جمعہ کی صبح دیکھنا حرام رہے - دوسرا نام غفران موج کا ہے - نیاز کو بریلی میں ملے تھے - رشتہ میں اُن کے خالہ زاد بھائی ہوتے تھے، ذہین اب بھی ہونگے - بہت اچھے شعر کہتے تھے راقم الحروف سے بھی ملاقات رہی تھی - تیسرا نام ہے اختر عادل روپ کا - یہ بھی بریلی کے بیٹے تھے، بحیثیت افسانہ نگار آج بھی معروف و مقبول ہیں اور کتنی ہی کتابوں کے مصنف ــــ یہ بھی نیاز مندوں میں سے تھے، ویسے نیاز اپنے آپ کو غفران موج اور اختر عادل روپ دونوں کا ناز بردار اور نیاز مند کہتے ہیں -اب خدا ہی جانے،

دوستوں کا حساب تو دلوں سے باہر کبھی آتا ہی نہیں۔

نیاز بدایونی دسمبر ۱۹۵۵ء میں پاکستان آگئے اور پھر ۱۹۵۸ء میں پہلی بار بدایوں جا کر واپس آئے تو پابجولاں تھے۔ معروف محقق اور برصغیر میں دیوانِ غالب کے پہلے ناشر مولانا نظام الدین نظامی کی پوتی اور مولوی احید الدین نظامی مالک نظامی پریس بدایوں کی صاحبزادی خالدہ ادیب بحیثیت شریکِ حیات ہمراہ تھیں۔ نیاز اب جناب مونس نظامی، مدیر "ذوالقرنین" بدایوں کے برادرِ نسبتی ہو گئے تھے۔ نیاز کے اس سلسلہ کے اعزا میں جناب ضیا الحسن آفتاب، جناب سراج الحسن جناب ذکی الدین قادری، جناب اختر بدایونی اور جناب ایجاد نظامی کا راقم الحروف بھی نیاز مند ہے۔

ان دنوں نیاز وزارتِ مالیات میں ملازم تھے۔ ان ہی دنوں شہر کے ایک ممتاز قانون داں اور ماہرِ تعلیم جناب ایم اے قیوم خاں نے اپنے بہادر شاہ ظفر کالج میں ادب اردو کی اعزازی تدریس اور ادبی ماہنامہ 'انجم' کی اعزازی ادارت کے لئے نیاز کو منتخب کیا۔ اپنی شبانہ روز مساعی سے نیاز نے 'انجم' کو آفتاب بنا دیا۔ اسی عرصہ میں نیاز وزارتِ مالیات سے سوسیمیانی سروسز میں آگئے اور آج تک اسی تنظیم کا ایک اہم تکنیکی عہدہ سنبھالے ہوئے ہیں۔

نیاز کے کراچی آنے کے بہت دنوں بعد تک ایسا محسوس ہوتا رہا کہ ان کا ذوقِ شعر گوئی اس شہر بازاوصد کاروبار میں کچھ سرد پڑ گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اب ان میں اپنے پاؤں

کھڑے ہونے کا احساس جاگ اٹھا تھا سر پر جو سائے تھے
وہ اُدھر پردیس بھارت میں تھے۔ چنانچہ زندگی کی اس کڑی
دھوپ میں موصوف " فاعلاتن مفاعلن فعلن سے زیادہ دوا اور
دوچار اور دوچھ کو اہمیت دینے لگے۔ مگر پھر بھی طبع یکسر رُک
کر نہیں رہ گئی کم کہا مگر کہتے رہے۔ کچھ نہ کچھ بزم آرائیاں جاری رہیں
پھر وہ مشاعروں کے مُعلن بن کر بھی اُبھرے کہ شعر و تقریر کا
سنگم اسی مقام پر عمدہ ہوتا ہے۔ فاضل اوقات میں ریڈیو
پاکستان کے لئے لکھا بھی اور زیڈ بائی مشاعرے بھی پڑھے کہ
اس میں آموں کے علاوہ گٹھلیوں کے دام بھی مل جاتے ہیں۔
انھوں نے بچّوں کے لئے بھی لکھا اور انھیں ریڈیو پاکستان کے
پروگرام "بچّوں کی دنیا" کا بہترین شاعر بھی قرار دیا گیا۔ اُس
زمانہ میں جبکہ اُن کے لکھنے کی رفتار سُست رہی بڑی بات
یہ ہوئی کہ ان کو اپنی بہت سی روایتی قدروں پر نظرِ ثانی کرنیکا
موقع مل گیا اور نئی قدروں سے اب تک دامن بچائے رکھنے
پر تاسف کرنے کا بھی۔

آدمی کے مزاج پر اس کے ماحول کا اثر پڑتا ہے اور شعر
بھی اسی مزاج سے پیدا ہوتا ہے جو بن چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ
نیاز کی شاعری بھی اسی ماحول کی شاہکار زیادہ ہے جس میں
اس نے اپنی اوّلین سانسیں لی تھیں۔ ان کے ابتدائی کلام میں
ہمیں کوئی ایسی نئی چیز نظر نہیں آتی جس پر ہم چونک پڑیں۔ ترقی
پسندوں کی بُری صحبت کے اثر سے کہیں کہیں لہجہ ضرور بدلا
ہوا ہے۔ ان دنوں اگر غلطی سے کوئی شعر نئے انداز کا انھوں نے

کھڑے ہونے کا احساس جاگ اٹھا تھا سر پر جو سائے تھے وہ اُدھر پردیس بھارت میں تھے - چنانچہ زندگی کی اس کڑی دھوپ میں موصوف " فاعلاتن مفاعلن فعلن سے زیادہ دو اور دو چار اور دو چھ کو اہمیت دینے لگے - مگر پھر بھی طبع یکسر رک کر نہیں رہ گئی کم کہا مگر کہتے رہے۔ کچھ نہ کچھ بزم آرائیاں جاری رہیں پھر وہ مشاعروں کے معلن بن کر بھی ابھرے کہ شعر و تقریر کا سنگم اسی مقام پر عمدہ ہوتا ہے - فاضل اوقات میں ریڈیو پاکستان کے لئے لکھا بھی اور ریڈیائی مشاعرے بھی پڑھے کہ اس میں آموں کے علاوہ گٹھلیوں کے دام بھی مل جاتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لئے بھی لکھا اور انھیں ریڈیو پاکستان کے پروگرام "بچوں کی دنیا" کا بہترین شاعر بھی قرار دیا گیا۔ اُس زمانہ میں جبکہ اُن کے لکھنے کی رفتار سست رہی بڑی بات یہ ہوئی کہ ان کو اپنی بہت سی روایتی قدروں پر نظر ثانی کرنیکا موقع مل گیا اور نئی قدروں سے اب تک دامن بچائے رکھنے پر تاسف کرنے کا بھی -

آدمی کے مزاج پر اس کے ماحول کا اثر پڑتا ہے اور شعر بھی اسی مزاج سے پیدا ہوتا ہے جو بن چکا ہوتا ہے - چنانچہ نیاز کی شاعری بھی اسی ماحول کی شاہکار زیادہ ہے جس میں اس نے اپنی اولین سانسیں لی تھیں - ان کے ابتدائی کلام میں ہمیں کوئی ایسی نئی چیز نظر نہیں آتی جس پر ہم چونک پڑیں - ترقی پسندوں کی بُری صحبت کے اثر سے کہیں کہیں لہجہ ضرور بدلا ہوا ہے - ان دنوں اگر غلطی سے کوئی شعر نئے انداز کا انھوں نے

کہہ بھی لیا ہو گا تو کنواری کلبیٹ سمجھ کر چھپا یا ہی ہو گا۔ یہ بے جان روایتی شعر بانی اس وقت تک نظر آتی ہے جب تک انھوں نے ایک خواب زلیخا نہ دیکھا۔

اچانک آج ان کا روئے زیبا ہم نے دیکھا ہے
انھیں دیکھا ہے یا خواب زلیخا ہم نے دیکھا ہے

یہ نیاز کا ۱۹۵۵ء کا شعر ہے۔ زندگی جب سُنی سُنائی کہانی سے ہٹ کر واردات قلب بنی تو شعر میں ذرا رنگ لہو نظر آیا۔ اور جب نیاز کو منزل کی جستجو ہوئی تو ان کی فکر نے یوں کروٹ لی۔

ہمرہی زنجیر پا تھی عزم وہمت کے لئے
بڑھ گیا میں کارواں سے مل گئی منزل مجھے

حالانکہ منزل کی جانب ذوق سفر میں ان کی اپنی ہمّت سے زیادہ قسمت کا ہاتھ تھا بلکہ منزل تو خود آغوش شوق وا کئے ان کی طرف بڑھ رہی تھی ورنہ اس میں شبہ ہی ہے کہ ایک بزدل زمیندار بچہ جسکی نوجوانی پر روایات کی زنگ لگی ہو وہ اتنی ہمّت کر دکھائے اور کارواں سے الگ ہو کر بڑھ جائے۔

آج نیاز کا مجموعۂ کلام "درد کو کتاب کیا" اشارہ کرتا ہے کہ ان کے شعور نے مسلسل کروٹیں بدلی ہیں اور اب وہ اظہار کی اس منزل سے گزر رہے ہیں جہاں فرد ومعاشرہ کی آمیزش کو سمجھ کر جو جی میں آئے دھڑلے سے کہتے رہیں۔ قدامت پسند روئیں تو ان کو رونے دیں کہ ان کا مقدّر تو ایسا ہی ہے۔ جدید پسند خفا ہوں تو بے نیازانہ بڑھ جائیں کہ ان کی جدیدیت میں بھی مدّت سے کوئی جدّت نہیں رہی ہے۔

جناب ابوالفضل صدیقی

نیاز بدایونی میرے چھوٹے بیٹے آصف کا بچپن کا ہم جماعت اور میرا گود وں کھلایا ہوا ہم عصر ہے ۔جس طرح چمن خانہ کے صحن میں نصب نونہال کے تمام مدارج ، رومیدگی سے پروان چڑھنے پھولنے تک نگاہ کے سامنے رہتے ہیں ، نیاز کا بچپن ، لڑکپن ، نوجوانی اور آج بفضلہ جوانی میرے سامنے گذری ہے ۔مجھے یاد ہے کہ میرے بیٹے آصف کے احباب کا ایک ٹولہ جس میں افضال ، فرخ ، شکیب ، نیاز ، ظفر بودی ، شمیم اور ظفر رمز شامل تھے ۔میرے غریب خانہ پر آیا کرتا تھا ۔ مجھے یہ ٹولہ اس لئے بھی عزیز تھا کہ یہ بدایوں کا نیا قافلۂ فکر تھا ۔اس گروہ میں شکیب اور نیاز خالصتہً شاعر تھے ۔اول الذکر اپنے نئے لہجہ سے دھوم مچا کر عین عالمِ جوانی میں داغ مفارقت دے گیا ۔آخرالذکر کو خدا سلامت رکھے میں پہچانتا ہوں وہ تو ریتی ، وہی فطری فنکار ، شاعر اور سخن سنج تھا اور آج خیر سے صاحبِ دیوان شاعر بن رہا ہے گو کہ تمام اصناف سخن پر قادر ہے مگر اس کا جو مجموعہ شائع ہو رہا ہے اس میں غزلوں کی کثیر تعداد ہے اور نظمیں صرف دس ۔

نیاز کی غزل کلاسیکی روایت میں آج کی بات اور نئے تراشے

ہوئے جام بلوریں ہیں کہنہ شراب کا متوازن سرور و کیف ہے۔ قصبہ نما چھوٹا سا تاریخی شہر بدایوں اپنے اندر شعر و ادب کا آثارِ قدیمہ قسم کا شہرِ خموشاں سمیٹے ہوئے ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

بڑی غزل اس کی مٹی کی تہوں کے اندر مدفون چلی آتی ہے۔ اس وقت یہ تحریر سپردِ قلم کرتے ہوئے کم بیش درجن بھر نام میرے ذہن میں ایسے آتے چلے گئے، جن کا سراغ مورخ ادب کو آثار قدیمہ کے ٹیلے کھیڑے پاتال تک کھودنے کے باوجود نہ ملے گا ؎

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اپنے وقت میں یہ عظیم غزل گو مشاعروں اور ادبی نشستوں میں دھوم مچا گئے۔ مگر حافظے اتنے درست تھے کہ غزل لکھ کے بیاض مرتب کرنا تو درکنار، کبھی ردّی کاغذ کے پرزے پر بھی لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی اور سینہ کے اندر ہی محفوظ رکھی۔ یہ ایک دو نسل سینہ بہ سینہ چلی اور پھر اپنی قبر کی مٹی تلاش کر کے جا چھپی۔ شجاع الدولہ شاہ اودھ اور وارن ہسٹنگز کی کرایہ کی فوج کے ہاتھوں جب حافظ رحمت خان کی حادثاتی شہادت کے سبب روہیلہ فوج کی تنسیخ ہوئی اور قلمرو رہیل کھنڈ کے ساتوں اضلاع ایک پاؤ صدی کے لئے اودھ کی سلطنت میں غصب ہو گئے، تو بدایوں بھی اودھ کے زیر تسلط آ گیا اور شعرائے بدایوں پر بھی لکھنوی شاعری کی چھاپ کے سائے نظر آنے لگے۔ ہر چند یہ چھاپ تو نہ بن سکی مگر دھندلی پرچھائیاں آنے والی

نسلوں پر باقی رہیں اور شعرائے بدایوں نے طرح نو کی داغ بیل اس زمین میں بھی ڈالی اور ثابت کیا کہ اس انداز میں بھی بڑی شاعری ممکن ہے، نیاز کی غزل کلاسیکی مائل بہ لکھنوی روایت میں آج کی بات ہے اور بیسوی صدی کے آخر ربع میں بھی بڑے شعر کی صف میں سربلند و ممتاز ۔

نیاز بدایونی کا تربیتی ماحول کا ساختہ پرداختہ تو ریتی انداز بیان اپنی آواز آپ ہے یہ آواز سچے احساس اور حقیقی درد کی ترجمان ہے ۔ یہ آواز نہ "دہلوی" ہے نہ "لکھنوی" نہ "لاہوری" —— اپنے اور صرف اپنے سانچے میں ڈھل کر نکلی ہے اور بڑی تیکھی، بڑی نادر اور بڑی خوبصورت ہے ذاتی احساس، واردات اور تجربات کی مظہر، جس میں سننے والوں کو کراچی کے دھوئیں، شور اور تعجیل میں الی ٹیپٹی فضا کے اندر بھی میر و مرزا کا لہجہ اور آواز سُنائی پڑتی ہے ۔

حضرتِ احسان دانش

نیازؔ بدایونی کی شاعری کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے
کہ وہ طویل سفر کر کے کسی سائے میں سستا رہا ہے۔
اُس نے اِس طویل سفر میں اِرد گرد پھیلی ہوئی چیزوں
کو اس وقتِ نظر سے دیکھا ہے کہ اُس کے اندر کا آدمی
کرچی کرچی ہو گیا مگر ٹوٹنے کی آواز کے بجائے شعر
تخلیق ہوئے۔ اور ایسے شعر جو تجربہ اور مشاہدہ کی دین
ہوتے ہیں۔ چنانچہ "درد کو کتاب کیا" کی شاعری، شاعری
علامتِ سفر نہیں، روداد سفر ہے۔ یہی سبب ہے، کہ تمام
اشعار جاندار ہیں جو ہر شخص کے یہاں نہیں ملتے۔

میں نیازؔ کو زندہ ضمیر کا شاعر کہتا ہوں اور بہت
کم لوگوں کو معلوم ہے کہ زندہ ضمیر کے شاعر کا دروازہ
وجدانی صحن میں کھلتا ہے جس سے شاعر کا شعور تسلسل کے
ساتھ فکر کے جادہ پر قدم زنی کرتا ہوا کہیں کا کہیں نکل
جاتا ہے اور اس عالم میں اس کے اشعار کا سلسلہ الہامی
ہوتا ہے جو شاعری نہیں عبادت کا ایک مقامِ خاص ہے۔

ڈاکٹر نور الحسن نقوی

ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ (بھارت)

نیاز بدایونی کے ذوقِ سخن کی ترتیب روایتی شاعری کے ماحول میں ہوئی مگر انہوں نے تازہ ہواؤں کے لئے اپنے دریچے کو کھلا رکھا۔ وہ نہ صرف زمانے کی کروٹوں اور مذاقِ سخن کی تبدیلیوں سے پوری طرح باخبر رہے بلکہ انہوں نے اِن کا پورا پورا اثر بھی قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کے مطالعے سے نہ صرف اِن کی مشاقی اور پختگی کا قائل ہونا پڑتا ہے بلکہ ایک طرح کی تازگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

یقین ہے کہ اِن کے کلام میں جہانِ تازہ کی نمود اور بھی نمایاں ہوگی۔

ڈاکٹر وزیر آغا

غزل ایک لڑٹے ہوئے تمثال دار آئینے کی طرح ہے کہ متعدد شعروں (کرچیوں) میں بٹ جانے کے باوجود ثابت آئینے کے عکس کو اپنے بطن میں محفوظ رکھتی ہے۔ اور ایک اچھے غزل گو شاعر کی پہچان یہ ہے کہ روایت کے چوکھٹے میں مقیّد ہوتے ہوئے بھی ایک کرچ کی طرح بالکل الگ دکھائی دیتا ہے۔ گویا اس کے ہاں روایت اور تجربہ کل اور جزو ایک دوسرے کے روبرو آجاتے ہیں۔ اگر روایت تجربے سے بے نیاز ہو جائے یا تجربہ روایت کے پلو کو چھوڑ دے تو غزل کا پیکر بُری طرح مجروح ہوتا ہے۔ نیاز بدایونی کی کامیابی اس بات میں ہے کہ اس نے غزل کی روایت

سے منقطع ہوئے بغیر اپنے ہونے کا اعلان کیا ہے یعنی اپنی انفرادیت کا احساس دلایا ہے۔ اور یہ احساس گھر سے اس کے ایک خاص تعلق خاطر کی دین ہے۔ نیاز بدایونی کا ایک شعر ہے ؂

گھر کا رشتہ عظیم ہوتا ہے گل کو چھوڑا تو مر گئی خوشبو

مکان اور مکین کا یہ لطیف رشتہ اپنے اندر معانی کی ان گنت تہیں چھپائے ہوئے ہے۔ نیاز کے ہاں گھر کے کئی مفاہیم ہیں۔ خود جسم روح کے لئے ایک گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر وطن بجائے خود ایک "گھر" ہے جسکی حفاظت سب سے بڑی عبادت ہے۔ ؏

گھر کے ہم محافظ ہیں تم ہوا تو آنے دو

مگر اصل چیز اینٹ گارے کا وہ مکان ہے جسے محبت اور رفاقت کے اجالے نے گھر میں تبدیل کر دیا ہے جس کی اداسی بھی شاعر کو بھلی لگتی ہے اور جس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شعر و ادب کی پرورش ہوئی ہے۔ مراد یہ کہ گھر کی مخصوص فضا نے اس کے مکین کے آئینۂ دل کو شفاف اور اس کے محسوسات کو اُجلا کر دیا ہے اور وہ اب اس قابل ہے کہ ہر جھونکے کی دستک کو پہچانے چاہے یہ دستک اس کے اپنے گھر کے دروازے کی ہو یا ہمسائے کے دروازے کی۔ گویا نیاز بدایونی نے اپنے ہمسائے کے گھر کے کرب کو بھی محسوس کیا ہے اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ایک ہی گلی محلے کے مختلف گھروں میں یگانگت اور رفاقت کا رشتہ باقی نہیں رہا۔ ؂

ایک ہی گلی کے لوگ اتنے اجنبی کیوں ہیں
ایک گھر میں ماتم ہے ایک گھر میں شادی ہے

شعار ہمسائیگی تو یہ ہے پڑوس کے لوگ سو نہ پائیں
ابھی دبے پاؤں جو گلی سے گذر گیا کون شخص تھا وہ

نیاز بدایونی کے ہاں گھر ایک استعارہ ہے جو تحفظ ذات بھائی چارہ محبت اور اخوت کے تصورات کی طرف ذہن کو راغب کرتا ہے ۔اس کے پس پشت مرکزی خیال یہ ہے کہ گھر اور کیمپ میں بعد القطبین ہے۔ جب خلق خدا گھروں کو خیر باد کہہ کر کیمپوں میں زندگی بسر کرنے لگتی ہے تو گویا دھرتی سے منقطع ہو کر ہوا میں معلق ہو جاتی ہے ۔ہجرت انسانی زندگی کا ایک انتہائی کرب انگیز حادثہ ہے مگر جب ہجرت گھر سے کیمپ کی طرف ہو تو یہ المیہ قرار پاتی ہے ۔ نیاز بدایونی نے استعارے کی زبان میں گھر کی اہمیت اور تقدس کا احساس دلایا ہے اور اس کی یہ روش قابل قدر ہے ۔بحیثیت مجموعی مجھے یہ کہنا ہے گھر نیاز بدایونی کی غزل کا مرکزی نقطہ ہے اور اس کی غزل میں ابھرنے والے باقی سب معاملات کسی نہ کسی طرح اس مرکزی نقطے ہی سے جڑے ہوئے ہیں ۔

جناب سلیم احمد

روایت اور جدیدیت کی بحث میں ہم بہت سی باتیں بھول گئے ہیں مثلاً ایک بات یہی ہے کہ شاعری کمپیوٹر کے ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے ایک شاعر یا ایک انسان کا تجربہ ہوتا ہے وہ انسان چند روایات کا پروردہ ہوتا ہے اور اپنے ماحول اور دوسرے انسانوں سے اپنے تعلق کی ہزار شیوہ داستان اپنی شاعری کے ذریعہ انسانوں کو سناتا ہے۔ میں نے نیاز بدایونی کے اشعار کو سنتے اور مطالعہ کرتے ہوئے محسوس کیا ہے کہ وہ جدیدیت اور روایت کی کشمکش میں پل کر اپنے انسان کو نہیں بھولا۔ وہ اپنے تجربے کو جس طرح محسوس کرتا ہے، کسی ہیر پھیر کے بغیر پوری سچائی سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا انسان جن روایات کا پروردہ ہے، ان میں مجھے بڑی جان نظر آئی۔ یہ انسان خوددار ہے، غیرت مند ہے، اس میں غموں کی سہار ہے، وہ خوشیوں کو محسوس کرنا جانتا ہے اور اسے انسانی رشتوں کی نزاکتوں کا شدید احساس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسان اس کائنات میں تنہا نہیں اور ہمسائے کا حق اس پر قرض ہے۔ نیاز بدایونی اس قرض کو اپنی متاعِ جان سے ادا کرنا چاہتا ہے۔ اسکے موضوعات انوکھے اور چونکا دینے والے نہیں ہیں وہ انکی تلاش بھی نہیں کرتا وہ تو ہماری مانوس دنیا کا ایک فرد ہے

اور مانوس تجربات ہی کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ ان تجربات،
بس نہ کرب کی اتنی شدت ہے کہ اس کی سہار مشکل ہو جائے
اور نہ غموں کی اتنی بھرمار کہ آدمی ان کے بوجھ تلے سانس بھی
نہ لے سکے۔ وہ جم کر بات کرتا ہے اور جو بات بھی کرتا ہے
اس میں غزل کا پورا سلیقہ موجود ہوتا ہے۔

نیاز بدایونی نئے استعاروں کی تلاش میں غزل کے
مخصوص استعاروں اور علامتوں سے گریز کا قائل نہیں وہ
جانے پہچانے علائم اور رموز میں بات کرتا ہے اور قرب و
دوری کی خستی پرچھائیوں کو ان کے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔
مجھے خوشی ہے کہ نیاز کی شاعری تدریجی طور پر زیادہ گہرے
اور زیادہ معنی خیز تجربات کی طرف بڑھ رہی ہے اور اگر
اس کا سلسلہ کلام جاری رہا تو اس بات کی پوری اُمید نظر آتی
ہے کہ وہ جلد اپنی شاعری میں ان تجربات کو بھی آئینہ دکھانے
لگے گا جن کی طرف، ابھی اس کے کلام میں صرف اشارے
ملتے ہیں۔

غزلیں

میری شاعری تجھ سے میرا حال کہدے گی
میں نے اپنی غزلوں کو گفتگو سکھا دی ہے

اپنی غزلوں میں ترا عکس اتارا میں نے
فن کو اک آگ کے دریا سے گذارا میں نے

آج اک شخص مرے دل کی طرف سے گذرا
اور پھر تجھ کو بہت دیر پکارا میں نے

نیند بھی روٹھ گئی خواب بھی رنجیدہ گئے
رات بھر تجھ کو غزل کہہ کے سنوارا میں نے

گھر کی تنہائی مجھے راس نہ آئے، داد تو دے
شہر میں ڈھونڈ لیا تجھ کو دوبارا میں نے

یاد رکھنا جو کسی باغ میں پھیلے ترا رنگ
تجھ کو محسوس کیا تھا چمن آرا میں نے

(۱۹۸۰ء)

پاؤں شیشے کی فصیلوں پہ جماتا کیسے
میں ترے شہر میں آتا مگر آتا کیسے

میں نے دل ہار کے لوگوں کو دیا ذوقِ جمال
مجھ سے مجنوں پہ کوئی سنگ اٹھاتا کیسے

لوگ مجھ سے تری چاہت پہ خفا تھے کیا کیا
تو مگر اپنا تأثر بھی بتاتا کیسے

میری جرأت سے یہ اک لہر تو دریا میں اٹھی
ایک پتھر کوئی طوفان اٹھاتا کیسے

خود مری ذات مجھے چھوڑتی جاتی تھی نیاز
اتنا تنہا تھا تو پھر اس کو بھلاتا کیسے

(۱۹۷۹ء)

میرا فن تھا کہ میری رُسوائی
آگ دل کی قلم نے برسائی

پھر اُجالا ابھی کتنی دیر کا ہے
دھوپ اگر پیڑ سے اُتر آئی

کوئی اپنا تھا پھینکنے والا
پتھروں سے گلوں کی باس آئی

نسبتوں سے ہنر کو بانٹ دیا
کون "میری" تھا کون "سودائی"

شہر ویرانہ لگ رہا ہے مجھے
اس کو کہتے ہیں کرب تنہائی

اپنا پرتو تھا آئینہ میں مگر
اپنی صورت نظر نہیں آئی

ہم کہ موسم شناس ہیں تو نیاز
زخم دیکھا کریں کہ پروائی

(۱۹۸۰ء)

ہر خلش پر نہ آہ آہ کرو
زندگی دوست ہے نباہ کرو

حادثہ ہے کہ ہو گیا ہوں تباہ
میرے ماضی کو مت گواہ کرو

روٹھ جانا بھی اک نوازش ہے
یہ نوازش بھی گاہ گاہ کرو

کیا ملا چند پتھروں کے سوا
اور شوق نجوم د ماہ کرو

اک تھکے کارواں کی منزل ہیں
اب یہ کچھ پیڑ مت تباہ کرو

شہر کے کج کلاہ ہیں مصروف
ہم غریبوں سے رسم و راہ کرو

(۱۹۷۸ء)

تو اتنا اچھا ہے کہ جس سے چاہے پیار نباہے گا

میں نے تجھے جتنا چاہا ہے اتنا کوئی نہ چاہے گا

لوگوں میں احساس تو جاگے درد کی لذت عام تو ہو

ایک ہمارے پوسٹ لگے گی سارا شہر کراہے گا

میں نے کتنی غزلیں تیری فرمائش پر لکھی ہیں

یاد آئے یہ شعر تو مجھ سے ملنے کو جی چاہے گا

سوچ رہے تھے تجھ سے بچھڑ کر چین نہ دے گی تنہائی

کب سوچا تھا یہ پاگل دل سڑکوں بیچ تراہے گا

رنجیہ غزل کا رنگ بکھیرے آئیں تو بازار میں لوگ

ان آتشیوں ناسمجھوں میں کس کو کون سراہے گا

(۱۹۰۹ء)

ہم تیری متاع رفتہ کو اے دیدۂ گریاں بھول گئے

اشکِ سرمژگاں یاد رہا اشکِ سرداماں بھول گئے

کیا فرق ہے نور و ظلمت میں کیا سوز و ساز میں رشتہ ہے

معلوم تو تھا ہم کو بھی مگر اے شمع فروزاں بھول گئے

ترک غم الفت پر یارو تنہا مجھ کو الزام نہ دو

اس دور میں اپنی بلقیسیں کتنے ہی سلیماں بھول گئے

جب تک بھی رہے ویرانہ میں کانٹوں کی رفاقت یاد رہی

ویرانہ سے گھر میں آتے ہی احساس بیاباں بھول گئے

زخموں کے دیے روشن کر کے اب گھر کو سجائے بیٹھے ہیں
جب سے یہ چراغاں دیکھا ہے ہر سرِ چراغاں بھول گئے

طے کر کے بڑا دشوار سفر گلشن میں بہار آئی تو مگر
اربابِ چمن اس عرصہ میں آدابِ بہاراں بھول گئے

چپ تھے تو نیاز ایسے چپ تھے خود شانِ کرم افسردہ تھی
مانگا تو کچھ اتنا مانگ لیا گنجائشِ داماں بھول گئے

(۱۹۷۶ء)

اے ہم نفسو لازم تو نہیں ہر ایک کو اوجِ دار ملے
ہونٹوں پہ مرے سچ بات تو ہے جب بھی اذنِ اظہار ملے

بستی کی طرف جاتے والو جب تم در جاناں تک پہنچو
سودا مرے سر کا کہہ دینا جو سنگ پسِ دیوار ملے

پہروں تو گماں یہ گذرے گا دیکھا ہے مگر دیکھا ہے کہاں
تکتے ہی رہیں گے چہروں کو ہم لوگ جو پھر اک بار ملے

کچھ روپ حجابوں میں بھی ملیں کچھ چہرے خوابوں میں بھی ملیں
اس شہر میں کیا رہنا کہ جہاں ہر شخص سرِ بازار ملے

یادوں کی چبھن کو کم کرنے پہونچے تھے اک اجڑی بستی میں
ٹوٹی ہوئی دیواروں پہ لکھے اپنے بھی کئی اشعار ملے

اپنی سانسیں تیری سنگت، آوارہ یوں سب تیز قدم
ہم بھی تو کسی کے ساتھ چلیں لیکن کوئی ہم رفتار ملے

(۱۹۸۰ء)

ہم مسلسل نیاز مند رہے

وہ بدستور خود پسند رہے

ماہ وش صبحدم بھی سوتے ہیں

اے دلِ زار نالہ بند رہے

خاک ہو کر گلوں کو چوم لیا

عشق کا حوصلہ بلند رہے

ہم سے دو چار تشنگانِ ازل

زہر پی کر بھی ہوش مند رہے

اور کچھ دیر کا اندھیرا ہے

اور کچھ دیر آنکھ بند رہے

(۱۹۵۵ء)

پیار کی میّت، عمر کا سوگ
سب میرے احساس کے روگ

دل تو سدا سچ بولے گا
سر حاضر ہے وار کے یوگ

تیرے دھیان سے ہیں دھنوان
اک جوگی کی مایا جوگ

من خوش ہے تو آگ سے کھیل
کیسی کرنی کیسے بھوگ

اڑا پرندہ، ٹوٹی ڈال
ایسا ہوتا ہے سنجوگ

نیچی دیواروں پہ نہ جاؤ
گھر میں ہیں قد آور لوگ

کیا کیا سنواتا ہے نیاز
ہم کو چپ رہنے کا روگ

(۱۹۸۰ء)

جس نگر پیار ہو بس جائیو
چاہتوں کو ترس جائیو

آشیاں کا تصوّر تو ہے
تم نہ اے خار و خس جائیو

میرا دل بھی اگر بجھ گیا
روشنی کو ترس جائیو

سوزِ دل میں تو یوسفؔ نہیں
میرا دامن جھلس جائیو

بادلو! کس قدر حبس ہے
شام تک تو برس جائیو

روپ کے مندروں میں نیازؔ
لے کے گیتوں کا رس جائیو

(۱۹۸۰ء)

دھوپ دیوار سے ڈھلتی ہے تو ڈھلنے دینا
گھر کے آنگن میں ہواؤں کو تو چلنے دینا

تم مرے شعر نہ سنّا کہ نفس گرم نہ ہو
اپنے احساس کا پتھر نہ پگھلنے دینا

جمع ہو جاتے ہیں بادل تو برس پڑتے ہیں
میری یادوں کا دھواں دل سے نکلنے دینا

چاہنا تم بھی کسی کو مرے معیار کے ساتھ
شاخ سر سبز ہے اس شاخ کو پھلنے دینا

ساری بستی کے در و بام سے غداری ہے
اپنے ہمسائے کا گھر آگ میں جلنے دینا

(۱۹۸۰ء)

غم میں بھی اک سرور نیا دے رہے ہیں آپ
میں درد مانگتا ہوں دوا دے رہے ہیں آپ

گلہائے سادہ دل کی سمجھ میں نہ آئے گا
پیغام جو بدستِ صبا دے رہے ہیں آپ

جب زندگی سے مجھ کو محبت نہیں رہی
اب مجھ کو زندگی کی دعا دے رہے ہیں آپ

اُس راہ میں ذلیل ہوئے اِس گلی میں خوار
ہاں ہم وہی فقیر ہیں کیا دے رہے ہیں آپ

کچھ اس قدر ہیں تیز مرے دل کی دھڑکنیں
جیسے یہیں کہیں سے صدا دے رہے ہیں آپ

بجھتے دئے سے یوں بھی نہ تھی روشنی کی آس
بجھتے دئے کو اور ہوا دے رہے ہیں آپ

اس دور میں خلوص کا جذبہ کہاں نیازؔ
کس مصلحت کو نامِ وفا دے رہے ہیں آپ

(۱۹۶۲ء)

صدا پہ جس کی دل پریشاں ٹھہر گیا کون شخص تھا وہ
اک آشنا تھا کہ اجنبی تھا کدھر گیا کون شخص تھا وہ

ابھی وہ بستی بسی ہوئی ہے بہت سے لوگوں کو یاد ہو گا
ہماری چاہت سے روپ جس کا نکھر گیا کون شخص تھا وہ

سُنا تو ہم نے سڑک کے اس پار پھر کوئی حادثہ ہوا ہے
کہا تو سب نے کہ ایک رہ گیر مر گیا کون شخص تھا وہ

درخت گرنے میں اے ہواؤ ! درخت ہی کا زیاں نہیں ہے
وہ جس سے مل کر وجود میرا بکھر گیا کون شخص تھا وہ

شعار ہمسائگی تو یہ ہے پڑوس کے لوگ سو نہ پائیں
ابھی دبے پاؤں جو گلی سے گذر گیا کون شخص تھا وہ

کبھی سرِ راہ اتفاقاً جو اجنبی کی طرح ملا تھا
نیازؔ پھر میری روح میں بھی اتر گیا کون شخص تھا وہ

(۱۹۸۸ء)

اے بادہ کشو آؤ کہ پھر جشن سبو ہے
ہر جام میں میری ہی امیدوں کا لہو ہے

جلووں کی لطافت میں ہے احساس کی گرمی
حیران ہوں یہ تیرا تصور ہے کہ تو ہے

اِمسال نہ دو مجھ کو بہاروں کا سندیسہ
دامن ہی سیا ہے نہ گریباں ہی رفو ہے

مجھ ہی پہ نہ رکھ وقت مرے قتل کا الزام
یہ دیکھ کہ کس کس کی ہتھیلی پہ لہو ہے

یہ سازشِ اربابِ خرد ہے کہ جنوں کو
اب چاک گریباں سے سوا فکرِ رفو ہے

(۱۹۶۱ء)

فردِ جرم تو اُس پر شہر نے لگا دی ہے
خود ضمیرِ قاتل نے اس کو کیا سزا دی ہے

فرقِ سنگ و آہن میں وزن کو نہ رکھ معیار
اصل تیشۂ فرہاد قوتِ ارادی ہے

گھر کے ہم محافظ ہیں تم ہوا تو آنے دو
اب یہ کھڑکیاں کھولو کیوں گھٹن بڑھا دی ہے

ایک ہی گلی کے لوگ اتنے اجنبی کیوں ہیں
ایک گھر میں ماتم ہے ایک گھر میں شادی ہے

تجھ سے پھر ملوں گا میں، واقعات یوں بھی ہیں

مصلحت کی ہر دیوار وقت نے گرا دی ہے

میری شاعری تجھ سے میرا حال کہہ دے گی

میں نے اپنی غزلوں کو گفتگو سکھا دی ہے

اہلِ محفلِ شب کو اے نیاز کیا معلوم

بے چراغ بستی بھی جاگنے کی عادی ہے

(۱۹۷۸ء)

کھوئے کھوئے بیٹھے ہیں دشت آگہی میں ہم
راستہ نہیں پاتے دن کی روشنی میں ہم

خون آرزو بھر کر ساغر تہی میں ہم
غرق کیف و مستی ہیں جشن تشنگی میں ہم

آپ کی توجہ میں جب سے فرق آیا ہے
اک کمی سی پاتے ہیں اپنی زندگی میں ہم

نکہتوں کا اک جھونکا ساتھ کھینچ لایا ہے
جان کر نہیں آئے آپ کی گلی میں ہم

اب خیال آتا ہے دل سی چیز بھول آئے
شہر گل سے نکلے تھے کس روا روی میں ہم

سنگ اٹھانے والے ہاتھ اب دعا کو اٹھتے ہیں
ہو گئے نیاز آخر خاک اس گلی میں ہم

(۱۹۶۵ء)

زہر دے کر جو مرے حال پہ ناشاد بھی ہیں
ان میں دو چار کے چہرے تو مجھے یاد بھی ہیں

پھول یہ پھول یہ فطرت کے رسیلے نغمے
اوس پڑ جائے تو مجبور کی فریاد بھی ہیں

دل اسیر غم جاں ذوق نظر آوارہ
ہم بیک وقت گرفتار بھی آزاد بھی ہیں

پھر انھیں میری وفاؤں کی ضرورت ہوگی
میں انھیں یاد بھی رکھوں گا مجھے یاد بھی ہیں

اپنے اسلاف پہ کیوں مجھ کو نہ ہو فخر نیاز
ان میں مرحوم زلالیؔ[1] ہی نہ تھے شادؔ[2] بھی ہیں

(۱۹۵۷ء)

[1] حضرت زلالیؔ تلمیذ مولانا حالیؔ [2] مولانا شادؔ بدایونی تلمیذ علامہ احسن مارہروی

وہ جو اک خنجرِ قاتل میں چمک ہوتی ہے

اصل میں خونِ شہیداں کی لپک ہوتی ہے

دل سے رخصت ہوا جب درد تو اندازہ ہوا

بعض اوقات سکوں میں بھی کسک ہوتی ہے

اب کوئی ناقدِ غم ہے نہ کوئی محرمِ شب

دل کے داغوں میں مگر اب بھی چمک ہوتی ہے

کاغذی پھولوں سے گلشن کو سجانے والو

پھول کا جوہرِ ذاتی تو مہک ہوتی ہے

شاخ گل کو ترے وعدہ سے بھلا کیا نسبت
شاخ گل میں بھی کہاں اتنی لچک ہوتی ہے

میں ترے حسن تکلّم کو غزل کہتا ہوں
ہر غزل میں ترے لہجہ کی کھنک ہوتی ہے

جذبہ و فکر کی بارش کے ٹھہرتے ہی نیا آج
ذہن کے گرد خیالوں کی دھنک ہوتی ہے

(۱۹۷۵ء)

ہم جو اس بت کو ستائش سے سوا کہہ دیتے
جانے کیا لوگ سمجھتے اسے کیا کہہ دیتے

اس بھرے شہر میں ملتا تو وفادار کوئی
ہم تو وہ تھے جو محبت کو خدا کہہ دیتے

حسنِ تخصیصِ کرم کا جو نہ قائل ہوتا
کچھ ہوس کار ہوس کو بھی وفا کہہ دیتے

چشمِ گریاں کو سلیقہ ہی نہیں رونے کا
ورنہ کچھ اشک ہی رودادِ وفا کہہ دیتے

لیلئ وقت کے ہاتھوں پہ ہے انساں کا لہو
ہم سے کچھ لوگ خفا ہیں کہ حنا کہہ دیتے

عکس کو جلوہ سے نسبت جو نہ ہوتی تو نیازؔ
اہلِ دل عکس کو کیوں جلوہ نما کہہ دیتے

(۱۹۶۳ء)

رات رُت کس قدر رنگیلی تھی
میں نے صرف ایک گھونٹ پی لی تھی

قصر پر بھی اٹھا تو تھا تیشہ
اس میں اک خوابگہ سجیلی تھی

ہم تری دُھن میں جان کھو دیتے
وقت کی آنکھ لال پیلی تھی

میری آنکھیں ہی کیا دمِ رخصت
آپ کی آستیں بھی گیلی تھی

ذکرِ خوبانِ شہرِ نو سے نیازؔ
آپ کی ہر غزل رسیلی تھی

(۱۹۵۸ء)

اپنی حیات ساغر تو یہ شکن میں تھی
ہاتھوں میں جام تھا تو حرارت بدن میں تھی

اوروں کے التفات سے اندازہ ہو گیا
کتنی سپردگی ترے بیگانہ پن میں تھی

اب گلستاں میں کوئی نہیں چاک پیرہن
عرصہ ہوا اک ایسی روایت چمن میں تھی

فنکار جب سے مصلحت اندیش ہو گیا
باقی کہاں رہی وہ صداقت جو فن میں تھی

اہلِ خرد کو کس نے سکھا دی خود آگہی
اب تک تو یہ ادا مرے دیوانہ پن میں تھی

پھولوں کی آگ دیکھ کے محسوس یہ ہوا
جیسے یہ شعلگی بھی مرے پیرہن میں تھی

حسرت ہی رہ گئی نظر آتی کہیں نیازؔ
وہ روشنیٔ طبع جو فضل الحسن[1] میں تھی

(۱۹۷۶ء)

[1] مولانا حسرت موہانی

ہر جفا پر مجھے دھوکہ ہے وفا ہو جیسے
اب اجازت ہے نہیں تم مجھے چاہو جیسے

ایسے گذری ہے ترے عشق سے پہلے مری عمر
روح اور جسم میں صدیوں کا خلا ہو جیسے

لوگ یوں چھیڑتے ہیں تذکرۂ دار و رسن
کوئی معیار جنوں ہی نہ رہا ہو جیسے

تم نے اس طرح چھڑایا ہے کچھ اپنا دامن
ساری دنیا نے مجھے چھوڑ دیا ہو جیسے

دیکھ کر ڈوبتے تاروں کا سماں آخر شب
یہ گماں ہوتا ہے دل ڈوب رہا ہو جیسے

دو نگاہوں کا تصادم بھی گوارا ہے نیازؔ
لیکن اس طرح کہ پیمانِ وفا ہو جیسے

(۱۹۶۰ء)

غنچہ تخلیق کیا تھا تو کھلایا ہوتا
اس قدر سلسلۂ غم نہ بڑھایا ہوتا

کس کو آنا تھا یہاں اور کسے آنا ہے
کوئی آتا تو مرے سامنے آیا ہوتا

جب بہار آئی ہے بستی میں جلے ہیں قندیل
اس برس تو کوئی ویرانہ سجایا ہوتا

دشت کے پھول کو بے رنگ سمجھنے والے
یہ بھی گل تھا جو تری زلف تک آیا ہوتا

شہر میں آمد ایّام بہاراں ہے نیازؔ
اپنے غم خانہ کو تم نے بھی سجایا ہوتا

(۱۹۶۳ء)

کس نے کہا تھا تجھ سے کہ اس رنگ لو کے ساتھ
اب دل کی فکر بھی ہے تری جستجو کے ساتھ

پھولوں کی بستیوں کے قوانین سخت تھے
زخم اور بڑھ گئے ہیں خیالِ رفو کے ساتھ

اک خوب تر کی یاد میں خوباں کے شہر سے
گذرا چلا گیا ہوں غم گفتگو کے ساتھ

ہم نے بھی وہ دماغ کہ دنیا نہ پا سکی
وابستہ کر دیا ہے تری آرزو کے ساتھ

تصویر آگئی ہے کہ اک جان انتظار
خود آگیا ہے قافلۂ رنگ و بو کے ساتھ

شب بھر کہی ہے میں نے مہکتی ہوئی غزل
گذرا ہے دن کا وقت جو اُس لالہ رو کے ساتھ

ہم دیدہ ور سہی مگر اس شہر میں نیاز
پھرتے ہیں اک فریب زدہ آبرو کے ساتھ

(۱۹۶۰)

سب مری تباہی میں تیرا نام لیتے ہیں
بوالہوس محبت سے انتقام لیتے ہیں

مست ہو کے چلتی ہیں موج گنگ و بوئے گل
یہ سلیق تجھی سے سب خوش خرام لیتے ہیں

جانِ شوق کہنے پر ہو گیا کوئی برہم
پیار میں تکلف سے کس کا نام لیتے ہیں

رسم میکدہ بدلی میری تشنہ کامی نے
کیف مجھ کو ملتا ہے لوگ جام لیتے ہیں

ترک گفتگو پر بھی ایک ربط قائم ہے
میں سلام کرتا ہوں وہ سلام لیتے ہیں

کیوں نیاز برہم ہیں سرو اور سمن ہم سے
ذکر موسم گل ہے کس کا نام لیتے ہیں

(۱۹۶۷ء)

تمہیں بھی ہوں گی شکایتیں کچھ، ہمیں بھی تم سے کئی گلے ہیں
مگر ابھی چند روز ٹھہرو خدا خدا کر کے دل ملے ہیں

ملالِ ترکِ چمن نہیں ہے کہ ظرف اہلِ چمن یہی تھا
مرا مذاقِ سفر سلامت قدم قدم پر چمن کھلے ہیں

وفا کا میں مدّعی بنا تھا اٹھے ہیں پتھر کھنچے ہیں تیور
محبّتیں جتنی جانفزا تھیں اسی قدر دل شکن صلے ہیں

یہ لالہ و گل یہ شعر و نغمہ یہ کیف و مستی یہ ماہ و انجم
خدا بچائے نگاہِ بد سے تری جوانی کے سلسلے ہیں

نیازؔ اس قید و بند سے بھی مرے تقاضے نہ رک سکیں گے
مجھے تو برگِ خزاں رسیدہ قفس کے نزدیک بھی ملے ہیں

(۱۹۵۶ء)

ستمگر تجھ کو بھی تنہا نہ دیکھا جائے ہے مجھ سے
خبر لے اپنی تیرا حال ملتا جائے ہے مجھ سے

مجھے کس حلبیں کی بستی میں لے آئے مرے یارو
مری دیوانگی کا ذوق روٹھا جائے ہے مجھ سے

مری ہمدردیوں میں بھی زمانہ کی سیاست ہے
مرا نام اب عجب لہجہ میں پوچھا جائے ہے مجھ سے

نظام میکدہ کی بات ہے میکش ہی سمجھیں گے
یہاں بھی یہ فقیہہ شہر الجھا جائے ہے مجھ سے

مجھے بھی یاد ہے اکثر مرے نزدیک رہتا تھا
یہی سایہ جو کوسوں دور دیکھا جائے ہے مجھ سے

نہ کیوں افسوس ہو مجھ کو غم دل سے جدائی کا
کہ میرا آخری ہمدرد چھوٹا جائے ہے مجھ سے

نیازؔ اک سانحہ ایسا بھی ہے رودادِ ہستی میں
بتایا جائے ہے مجھ سے نہ بھولا جائے ہے مجھ سے

(۱۹۷۶ء)

نہیں جو اتنی بھی آگہی تو قفس زدوں کو خبر بھی کیا ہے
قفس ہی کو گلستاں بنا لیں کہ اب یہاں سے مفر بھی کیا ہے

خود اپنے ہی جسم سے گذرنا خود اپنی ہی روح میں ٹھہرنا
یہی جو ٹھہری سفر کی صورت ضرورت ہم سفر بھی کیا ہے

ہزار چہرے خیال میں تھے نظر تمہارے ہی رخ پہ ٹھہری
تمہارا رخ پھر تمہارا رخ تھا مگر ہماری نظر بھی کیا ہے

ہمارے دھندلائے بام و در پہ پڑوس کے لوگ خوش ہیں لیکن
وہ جس کو آنگن کی دھوپ کہئے ادھر بھی کیا تھی ادھر بھی کیا ہے

چلے تو بے انتخاب جادہ رکے تو بے عزم و بے ارادہ
وہ ابتدائے طلب بھی کیا تھی یہ انتہائے سفر بھی کیا ہے

ازل کے دن ہم بھی شادماں تھے نیاز ذوق سلیم لے کر
اور اب غزل کہہ کے سوچتے ہیں یہاں بھلائے ہنر بھی کیا ہے

(۱۹۷۴ء)

ساقیؔ، مے، پیمانہ، جام
میرے غم خواروں کے نام
تنہا راتوں کی روداد
ذہن آوارہ نیند حرام
ہستی کی عظمت تدبیر
قسمت کی امیدیں خام
دل سے پہلے رخصت ہوش
کون آتا ہے وقت پہ کام
لکھئے دل کا حال نیازؔ
لیکن لکھئے کس کے نام
(۱۹۵۶ء)

ایسا بھی نہ رنگ دوستی ہو

کل شہر کا شہر اجنبی ہو

اک عمر ہے قربِ یک نفس بھی

ٹھہرے جو یہ پل تو اک صدی ہو

اُس شخص کا گھر بھی جانتی ہو

اس شخص کی حشر خیز یادو

یوں خشک ہے جھیل جھیل جیسے

دریاؤں میں آگ لگ گئی ہو

سب ایک ہیں بدلباس و خوش پوش
سڑکوں پہ جو گرد اڑ رہی ہو
کم ہو تو گلی میں کچھ اندھیرا
ہمسائے کے گھر ہی روشنی ہو
پھیلی تو ہے اے نیاز پھر دھوپ
اب آنکھ نہ خواب دیکھتی ہو

(۱۹۸۰ء)

جو بگڑے تو حالات کی بات ہے
بنے تو کرامات کی بات ہے

پہونچ ہی گئے تھے کنارے پہ ہم
مگر اتفاقات کی بات ہے

گل و نسترن پیرہن چاک ہیں
تلافیٔ مافات کی بات ہے

ہمیں بھی تعلق نہیں آپ سے
مگر دیکھئے بات کی بات ہے

محبت سے آگے ملوں گا تجھے
محبت روایات کی بات ہے

کہاں رکھ دے رحل و قرآں نیازؔ
جہانِ خرابات کی بات ہے

(۱۹۵۶ء)

بار جنوں بھی ہم نفس تیرے اٹھائے کیا اٹھا
ہم ہی طلب کئے گئے جب کوئی مسئلا اٹھا

ہوش مجھے نہ آئیگا کیف تو مجھ پہ چھائے گا
خواب تو ٹوٹ جائے گا جام تو ساقیا اٹھا

بجھ گئی شمع انجمن ہو گئے دل دھواں دھواں
آپ کے بعد بزم سے نور کا سلسلا اٹھا

ایک مرے لہو سے کیا شہر کی پیاس بجھ گئی
اب کوئی نعرہ زن ہوا اب کوئی دوسرا اٹھا

تیرے بقول اداس ہیں سب مرے حال زار پر
اے مرے مہربان دوست آج تو آئینا اٹھا

(۱۹۷۸ء)

بے دلی کی زندگی میں ہے سکوں حاصل مجھے
پھر بھی اکثر یاد آ جاتا ہے تو اے دل مجھے

سچ کہا یارو کہ دنیا دیکھنے کی چیز ہے
اور اگر دنیا سے پیارا ہو مرا قاتل مجھے

لالۂ و گل کا تبسّم اک مجازی بات ہے
مجھ سے ملتا ہے تو یہ پردے اٹھا کر مل مجھے

بھر ہی زنجیر پا تھی عزم و ہمّت کے لئے
بڑھ گیا میں کارواں سے مل گئی منزل مجھے

ہو مبارک تجھ کو تیرا حال اے جانِ نیاز
میں تو رخصت ڈھونڈتا ہے میرا مستقبل مجھے

(۱۹۵۶ء)

اُن سادہ دلبروں کی ہمیں چاہ تھی کہاں
اب ڈھونڈتے ہیں صحبتِ رفتہ گئی کہاں

"جیتے رہے تو غیر کا ماتم کریں گے ہم"[۱]
جو آدمی کا غیر ہو وہ آدمی کہاں

میرا نصیب ان کا کرم حسنِ اتفاق
ورنہ میں غم شناس کہاں اور خوشی کہاں

جینے کا شوق کوچۂ جاناں میں رہ گیا
اب زندگی کا وہم سا ہے زندگی کہاں

مسجد میں اہلِ شہر کو رسماً نہ لے چلو
نیت بغیر تکملۂ بندگی کہاں

(۱۹۵۶ء)

۱ قبلہ شادؔ بدایونی سے مستعار

شاید مرے نالے ہی کچھ خام نکلتے ہیں
ورنہ وہ ستمگر کیا پتھر بھی پگھلتے ہیں

گُل اوس سے گھبرا کر کیوں رنگ بدلتے ہیں
ہنسنے کی ریاضت میں آنسو بھی نکلتے ہیں

تنہائی بجائے خود ہنگامۂ محفل ہے
ورنہ کہیں صحرا میں دیوانے بہلتے ہیں

ان تیرہ فضاؤں سے مایوس نہ ہو رہرو
پھولوں کے تمنائی کانٹوں پہ بھی چلتے ہیں

ہر لغزشِ مستانہ مستوں کی عبادت ہے
گرتے ہیں تو ساقی کے بازو پہ سنبھلتے ہیں

(۱۹۵۵ء)

جب یہ یادِ بتاں گذرتا ہے

دن بڑا شادماں گذرتا ہے

رہ نشینو بہت ملول نہ ہو

اب کوئی کارواں گذرتا ہے

یادِ محبوب کا ہر اک لمحہ

گل فشاں گل فشاں گذرتا ہے

سب گذرتے ہیں تیرے کوچہ سے

کوئی ہم سا کہاں گذرتا ہے

ایک شب کا فراق ارے توبہ

اک صدی کا گماں گذرتا ہے

(۱۹۵۷ء)

ہر غم کو چھڑا لیا ہے ہم سے
مشکل ہے نباہ تیرے غم سے

تخلیق کا شاہکار بھی ہم
کونین کی ابتدا بھی ہم سے

اپنی ہی تلاش ہو تو بہتر
اک کوزۂ گِل بھی جام جم سے

یاروں کو گلے لگانے والے
یاروں کا گلہ کریں گے ہم سے

اس دور کو حق کا دور کہہ کر

ہر کذب لکھا گیا قلم سے

حالات کا خود مشاہدہ کر

تاریخ کا علم پوچھ ہم سے

اب تو وہ چھتیں شکستہ ہونگی

ملتے تھے جہاں ہم اک صنم سے

(۱۹۷۹ء)

میں اکثر سوچتا ہوں شمع سے پروانہ ملتا ہے
کہ اپنی روح سے اک جسم آزادانہ ملتا ہے

چلو اچھا ہوا تم دیکھ آئے شہرِ گل یارو
وہی گلیاں سہی لیکن کوئی دیوانہ ملتا ہے

گلے لگتا ہوں تو سب کے بدن کو سرد پاتا ہوں
بظاہر مجھ سے جو ملتا ہے بے تابانہ ملتا ہے

ہم اپنا رنگ یوں رکھتے ہیں جیسے تو نہیں ملتا
مگر خوشبو کہے دیتی ہے تو روزانہ ملتا ہے

خدا صہبا[۱]، غزل، مینا و ساغر سب کو خوش رکھے
نیاز اپنے ہی گھر میں مجھ کو اک میخانہ ملتا ہے

(۱۹۷۸ء)

۱ بیٹی، بھتیجیوں اور بھتیجہ کے نام

اُن کو مری وفا کا یقیں آئے گا ابھی
اُن کے مزاج پر نہ کرو تبصرا ابھی

میری نوا کا شور سرِ عرش تھا ابھی
میں چپ ہوا تو ٹوٹ گیا سلسلا ابھی

بگڑے ہوئے بھی ہیں مرے چہرے کے کچھ نقوش
نظروں کے سامنے ہی رہے آئینا ابھی

دوری اگر گھٹے تو کچھ اپنا پتہ چلے
سب لوگ پست قد ہیں جو ہے فاصلا ابھی

عشرت کدہ کے نغمہ گرو اور ایک رقص
اک اور غم کدہ کا دیا بجھ گیا ابھی

ممکن ہے کچھ گھٹن میں کمی ہو سکے نیازؔ
گذرا تو ہے اک ابر برستا ہوا ابھی

(۱۹۷۵ء)

ہر گلی کوچہ میں اپنے دل کو بہلاتے رہے
جانے کیوں دو چار چہرے پھر بھی یاد آتے رہے

وہ ہمارا دکھ بٹاتا جو ہمیں پہچانتا
ہم تو آوازوں کو دیواروں سے ٹکراتے رہے

فصل گل میں ہم پہ کیا گذری بھلا دیتے مگر
چند کانٹے روح کو تکلیف پہونچاتے رہے

زندگی کو کس قدر لفظوں میں الجھایا گیا
اک تماشا تھا کہ لوگ آتے رہے جاتے رہے

ہم نے اپنے رہبروں کو دور تک دیکھا نیازؔ
کچھ شناساؤں کے چہرے بھی نظر آتے رہے

(۱۹۷۹ء)

وہ سرِ راہ ملے ہم نے نظارہ نہ کیا
کتنی معصوم تمنا کا گلا گھونٹ دیا

اپنے دامن سے خبردار رہیں اہل نظر
تیز ہے آج شب شہرِ غریباں کا دیا

ساغرِ چشم محبت کی ہوس تھی سب کو
جب مجھے ہوش نہ آیا تو کسی نے نہ پیا

نامکمل سا تبسم بھی کرم تھا ان کا
اس کا شکوہ نہ کرو کون مرا کون جیا

میں نیازؔ آپ رہا راہ نمائے ہستی
میں نے منزل کے لئے خضر کا احساں نہ لیا

(۱۹۵۶ء)

اہلِ دل ممکن بھی ہے ان کی تلاش آساں بھی ہے
اور تم اس دھن میں خود کھو جاؤ یہ امکاں بھی ہے

اے امیرِ کاروانِ صبح ! آہستہ خرام
آج تیرے ساتھ بیمارِ شبِ ہجراں بھی ہے

ہم نفس، ہم گل تو کر دیتے چراغ انتظار
اس میں اک پہلوئے توہینِ شبِ ہجراں بھی ہے

زندگی کو امنِ ساحل ہی سمجھ بیٹھے تھے ہم
ڈوبنے والے نے ثابت کر دیا طوفاں بھی ہے

میں تو خود کو آدمی کہہ کر بہت خوش ہوں نیازؔ
دشمنِ ہستی جہاں کچھ اور ہیں انساں بھی ہے

(۱۹۵۸ء)

رکھتے ہیں ظرف بے سر و ساماں بھی دیکھئے
ٹوٹی حویلیوں پہ چراغاں بھی دیکھئے

پہلے بھی کیا ملا ہے ہمیں حصّہ بہار
تبدیل کر کے نظم گلستاں بھی دیکھئے

سچائیوں سے آنکھ ملانا ہنسی نہیں
اے اہل شام، شامِ غریباں بھی دیکھئے

دشمن کی پستیوں پہ ملامت کے ساتھ ساتھ
دشمن کے کارہائے نمایاں بھی دیکھئے

تنہائیوں کے کرب میں مرنا تو ہے مگر
کچھ دن نیازؔ شہرِ نگاراں بھی دیکھئے

(۱۹۷۶ء)

ہوس مشرب حیات عشق کو آساں سمجھتے ہیں
نہ جانے واہمہ کو لوگ کیوں امکاں سمجھتے ہیں
نگاہیں پھیر کر تم جذب دل بھی آزما دیکھو
ہم اہل دل ہیں اور یہ مرحلہ آساں سمجھتے ہیں
ہر اک ہے مدّعی آدمیت دیکھنا یہ ہے
کسے کہتے ہیں انساں اور کسے انساں سمجھتے ہیں
تجھے پہچاننے کی ہمتیں اور یہ جہاں والے
کچھ ایسے کہتے ہیں جیسے بہت آساں سمجھتے ہیں
نیاز ان دوستوں کو ہے مرے بارے میں خوش فہمی
مجھے جو یار یاب محفل خوباں سمجھتے ہیں

(۱۹۵۳ء)

چاہتوں کا ذکر کیا کرتے تو نفرت کم سے کم
چھوٹ جاتی میری خوش فہمی کی عادت کم سے کم

بات موسم کی ہے یارو کل بھی آئے گی ضرور
آج تو پوچھو کہ ہے سوچ میں شدت کم سے کم

ایسے گھر بھی ہیں اسی شہر چراغاں میں، جہاں
غم زیادہ سے زیادہ ہے مسرّت کم سے کم

شاید اس احساس ہی سے کرب گھٹ جائے کہ آج
آپ نے پوچھا تو از راہِ عنایت کم سے کم

لالۂ و گل کو اگر موسم کا اندازہ نہ تھا
خار ہی دیتے بہاروں کی ضمانت کم سے کم

(۱۹۷۷ء)

اچانک آج ان کا روئے زیبا ہم نے دیکھا ہے
انھیں دیکھا ہے یا خواب زلیخا ہم نے دیکھا ہے

یہ دل حاضر ہے اے جلوو! حجاب گلستاں کب تک
ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا ہے تنہا ہم نے دیکھا ہے

جنوں والوں نے بستی چھوڑ دی کم ظرف تھے آخر
ہمیں دیکھیں بقیدِ ہوش کیا کیا ہم نے دیکھا ہے

یہ اندیشے تو یارو پیاس اور اپنی بڑھا دیں گے
چمکتی ریت دیکھی ہے کہ دریا ہم نے دیکھا ہے

نہ ہو افسردہ تا حد نظر چھائے اندھیرے سے
افق کے اُس طرف پھیلا اجالا ہم نے دیکھا ہے

(۱۹۵۵ء)

دشمن مری نیندوں کا کوئی پردہ نشیں ہے
اور اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہے

وہ شخص ترے شہر میں کاہے کو پھرے گا
تو جس کے تصوّر سے زیادہ ہی حسیں ہے

یہ طنز بھی تسلیم کہ میں صاحب دل ہوں
ایسی کوئی شے میرے مقدر میں نہیں ہے

رہنے دو اکیلا مجھے کچھ دن مرے یارو
میں اور کہیں ہوں مرا دل اور کہیں ہے

پچھتاؤ گے یارو نہ کرو چاہ کسی کی
اس شہر میں ایسا کوئی دستور نہیں ہے

(۱۹۷۲ء)

جو اس کو دیکھنے والا دکھائی دیتا ہے
وہ خود بھی ایک تماشا دکھائی دیتا ہے

مرا ہنر مرا فن قد میں مجھ سے اونچے ہیں
کہاں ہوں میں یہ مجھے کیا دکھائی دیتا ہے

مجھے بھی خطرۂ شب خوں ہے دوستو لیکن
ابھی تو دن کا اُجالا دکھائی دیتا ہے

وہ ایک لفظ جسے ہم خلوص کہتے ہیں
تمام شہر کو دھندلا دکھائی دیتا ہے

یہ واقعہ ہے کہ خوابوں میں بس گیا ہے کوئی
یہ خواب ہے کہ وہ تجھ سا دکھائی دیتا ہے

یہی جو کوچۂ و بازار میں سکوت رہا
مجھے یہ شہر اجڑتا دکھائی دیتا ہے

خلوص اہل سیاست ڈبو نہ دے کہ نیازؔ
سراب دور سے دریا دکھائی دیتا ہے

(۱۹۷۵ء)

یہ بات کر مرے ساقی تری خوشی کیا ہے
خوشی سے زہر پلا دے شراب ہی کیا ہے

نگاہ و دل مرا جینا حرام کر دیں گے
اب آ گئے ہو تو ایسی رواروی کیا ہے

مجھے غرض کی ترازو میں تولنے والے
یہ دوستی کی تجارت ہے دوستی کیا ہے

نہ تھے چراغ فروزاں تو کیا اندھیرا تھا
کیا گیا ہے چراغاں تو روشنی کیا ہے

ہمیں چمن میں خزاں کا سبب سہی لیکن
ہمارے بعد ضمانت بہار کی کیا ہے

نیاز ابھی سے فسردہ ہو دن ڈھلے، ابھی
ابھی تو صبح بہت دور ہے ابھی کیا ہے

(۱۹۷۶ء)

شہر خوباں میں ہر گلبدن خوب ہے
میرا محبوب پھر میرا محبوب ہے

ہم تو کچھ اس طرح پیرہن چاک ہے
ہر زلیخا ہمی سے تو منسوب ہے

کچھ کہیں بھی تو اس شخص سے کیا کہیں
جو شکایت سے پہلے ہی مجوب ہے

آپ کو پھول سے کس نے تشبیہہ دی
آپ محبوب ہیں پھول مرغوب ہے

شاد رہتے ہو تم اے نیازؔ آجکل
یہ بھی کیا ضبط غم کا اک اسلوب ہے

(۱۹۷۴ء)

چہروں کی شناسائی چھوڑ دجب درد کا رشتا کوئی نہیں
یہ بات یہیں تک رہنے دو ہم دونوں میں سچّا کوئی نہیں
میخانہ میں ہر انجان ہمیں صدیوں کا شناسا بنکے ملا
جب دل ٹوٹا تو یاد آیا شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
بن برسے اڑتے بادل کو اتنا بھی تو اندازہ نہ ہوا
یہ دریا دھوپ میں سوکھے ہیں یا شہر میں پیاسا کوئی نہیں
ان آتے جاتے چہروں میں کیا ڈھونڈ رہا ہے برسوں سے
اس بھیڑ میں سب سے دور کھڑا وہ شخص کہ جس کا کوئی نہیں

کل رات بہت بھاری گذری ہر آہٹ پر دل چونک پڑا
کس کرب سے میں کہتا ہی رہا جھونکا ہے ہوا کا کوئی نہیں

اے شہر کی گلیو رکھ لینا کچھ خاک مرے دامن کے لئے
ممکن ہے کہ پھر اک بار ملوں ہرچند ارادا کوئی نہیں

ہونا تھا نیازؔ اک دن تنہا ملنا تھا حریفِ دل آخر
اب کس کی شکایت کرتے ہو تم نے تو کہا تھا کوئی نہیں

(۱۹۷۹ء)

میں خود اپنی ہی نظر میں بے وفا کیوں ہو گیا
جس سے قربت تھی اسی سے فاصلا کیوں ہو گیا

فصل گل میں تھی گراں مجھ پر ہوائے تیز و تند
ٹوٹ کر ٹہنی سے اک پتّہ جدا کیوں ہو گیا

چاند تارے بھی کسی دامن میں اترے ہیں کبھی
اس قدر اونچا بھی دستِ مدعا کیوں ہو گیا

ساری دنیا کو یہ غم کیوں گھٹ گیا انساں کا قد
مجھ کو یہ صدمہ مرا سایہ بڑا کیوں ہو گیا

ہم کو برسوں بعد ہمسائے نے بھیجا ہے سلام
لوگ چپ چپ ہیں کہ پھر یہ سلسلا کیوں ہو گیا

حشر میں خالی جبیں کیا لے کے جاؤ گے نیازؔ
ایک سجدہ قرض ہی رہتا ادا کیوں ہو گیا

کتنے دکھ تھے کتنی سوچیں کس کس سے چھٹکارا ہوا
ڈال تو اب بھی جھوم رہی ہے ٹوٹا پت آوارا ہوا

پانی کی اک بوند نہ برسی سارا ساون بیت گیا
ہم کو تو ین موسم پیتے اک اک گھونٹ انگارا ہوا

جھوٹے تھے سب خواب سہانے جب ان کی تعبیر ملی
دل کو اسی امید نے مارا دل جس کا گہوارا ہوا

اس بازار میں جھوٹے سکھ بھی کتنے مہنگے مول بکے
کم نظروں کے شہر میں آکر نادم خود بنجارا ہوا

جیتے جی تو یارو ہم سے بولو پیار کے میٹھے بول
جگ چھوٹا تو کیا جانیں گے کتنا سوگ ہمارا ہوا

(۱۹۷۷ء)

کس کو نشّے رات کے پچھلے پہر تک آئیں گے
ہم ہی اب ڈوبے تو پھر اگلی سحر تک آئیں گے

آگ ہمسائے کے گھر کی بھی قیامت ڈھائے گی
کل یہی شعلے ہمارے بام و در تک آئیں گے

آدمی سیکھے گا کب تک احترام آدمی
کتنے پتھر اور اک شوریدہ سر تک آئیں گے

تو بہت یاد آئے گا اے واقفِ حالاتِ غم
جب مری پرسش کو مجھ سے بے خبر تک آئیں گے

وہ کہ جن کو بادۂ و ساغر کی باتیں ہیں حرام
دل کا شیشہ ٹوٹنے دو شیشہ گر تک آئیں گے

مل گیا درد آشنا کوئی تو گھٹ جائیگا کرب
کوئی دیکھے گا تو زخم دل نظر تک آئیں گے

چند ایوانوں کی دیواریں گری تو ہیں نیازؔ
اب اجالے ہم غریبوں کے بھی گھر تک آئیں گے

(۱۹۷۷ء)

سب ہی رہ ہستی میں ستانے کے لئے آئے
اک شخص تو سینے سے لگانے کے لئے آئے

اس چہرہ پہ اک خندۂ پنہاں کی بدولت
سو رنگ محبت کو چھپانے کے لئے آئے

کیا جانئے کب آنکھ کھلے اہل خرد کی
کب دور جنوں حشر اٹھانے کے لئے آئے

میں اس پہ بھی راضی ہوں مری گردش تقدیر
غم میری طرف سارے زمانے کے لئے آئے

کب سے ہوں میں اس کارگہ شوق میں تنہا
کوئی تو مرا ہاتھ بٹانے کے لئے آئے

کب سے ہے نیاز انجمنِ دل میں اندھیرا
اے کاش کوئی شمع جلانے کے لئے آئے

(۱۹۶۷ء)

شمع محفل ہی کیا پگھلتی ہے
رات بھی ساتھ ساتھ ڈھلتی ہے

لوگ پت جھڑ سے کیوں ہراساں ہیں
خشک ہو کر ہی شاخ پھلتی ہے

ہم غریبوں کی طبعِ آشفتہ
بے سہارا کہاں سنبھلتی ہے

یوں بھی آتا ہے دھیان میں کوئی
اپنی سنگت بھی مجھ پہ کھلتی ہے

اتنے چپ بھی نہ اے نیازؔ رہو
بات اور اس طرح اچھلتی ہے

(۱۹۶۴ء)

سخت کوشی کا دور دورہ ہے
بس خموشی کا دور دورہ ہے

اٹھ گیا اعتماد چارہ گری
زہر نوشی کا دور دورہ ہے

پارساؤں کے پاؤں کانپ گئے
خم بدوشی کا دور دورہ ہے

اے بہاروں کو پوجنے والو
گل فروشی کا دور دورہ ہے

ناخداؤں کے گیت گاؤ نیازؔ
خرقہ پوشی کا دور دورہ ہے

۱۹۵۷ء

سب اہل نظر میں یہ بصیرت کب ہے
ہر شمع اجالے کی ضمانت کب ہے

پیاسا ہوں کہ کم ظرف ہوئے بادہ گسار
ساقی سے مجھے کوئی شکایت کب ہے

ہر گل ترے گیسو میں سجا دوں لیکن
سب گل ہیں مگر سب میں لطافت کب ہے

فریاد ہے خس خانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ
کہتے ہیں کہ سورج میں تمازت کب ہے

ظاہر ہے اگر میری خرابی تو نیاز
پوشیدہ مرے گھر کی شرافت کب ہے

(۱۹۷۱ء)

مری وفا میں اگر سادگی نہیں ہوتی

باعتبارِ زمانہ بُری نہیں ہوتی

خدا گواہ عزیزوں میں خوئے ہمدردی

قرینِ عقل سہی، واقعی نہیں ہوتی

ہمیں تو سب ہی تباہ و خراب کہتے ہیں

تمہاری بات تو محسوس بھی نہیں ہوتی

تمہاری کم نظری ہے ستم زدوں سے گریز

ستم زدوں کی طبیعت بُری نہیں ہوتی

نیاز دیکھ لئے آپ کے خلوص نواز

کسی سے نصف ملاقات بھی نہیں ہوتی

(۱۹۵۹ء)

باغ میں آئے تھے سائے کی تمنا لے کر
دھوپ میں بیٹھ گئے پھول سا چہرا لے کر

درد چونکا تھا کہ لرزاں ہے شب تار ہنوز
اب اٹھے گا تو اجالا ہی اجالا لے کر

ایسا مشکل تو نہیں دل کا بہلنا یارو
پھول ہی دیکھ لئے نام کسی کا لے کر

شیخ کے رشد و ہدایت کا بڑا شہرہ تھا
ہم بھی نکلے ہیں حدیث مے و مینا لے کر

قصر شاہی کی فصیلوں پہ چراغاں ہے نیاز
غیرتیں پاؤں پکڑتی ہیں کہ تیشا لے کر

(۱۹۶۲ء)

ٹوٹے اگر امیدِ سحر ٹوٹ رہی ہے
میں اب بھی سمجھتا ہوں کرن پھوٹ رہی ہے

میرے ہی نشیمن سے یہ ویرانہ چمن تھا
میرے ہی نشیمن پہ بلا ٹوٹ رہی ہے

میں راہِ محبت سے گریزاں تو نہیں ہوں
ٹھہرو کہ مری زندہ دلی چھوٹ رہی ہے

تنہا مجھے جینے میں کوئی لطف نہ آیا
مجبور سمجھنا کہ قسم ٹوٹ رہی ہے

پیرانِ حرم جبہ و دستار سنبھالیں
زنجیرِ روایاتِ کہن ٹوٹ رہی ہے

(۱۹۵۵ء)

کیا انوکھے چلن ہو گئے ہیں
راہ بر راہ زن ہو گئے ہیں

میرے حسنِ نظر کو دُعا دیں
گلبدن، گلبدن ہو گئے ہیں

جینے والوں کو زخم بدن کبھی
روح کا بانکپن ہو گئے ہیں

زنگ آلودہ تیشے اٹھا کر
بوالہوس کوہ کن ہو گئے ہیں

ہم نیاز ان بتوں کی بدولت
صاحب فکر و فن ہو گئے ہیں

(۱۹۵۵ء)

پیاس تھی اور تشنگی افسانہ کی
ہم نے یوں بھی خدمت میخانہ کی

ایک دیوانہ کو کیا ہوش طواف
سب نے توہینِ غمِ پروانہ کی

لوگ رسماً پوچھتے ہیں قبل مرگ
آخری خواہش دلِ دیوانہ کی

بادہ خواری کا یہ پہلو بھی تو ہے
کیوں کسی نے نیت میخانہ کی

کچھ تو تھا آخر کہ ہم نے زندگی
خواب کی، الزام کی، افسانہ کی

(۱۹۶۱ء)

جان من میں تو یہ سوچتا ہوں
اور کبھی ٹوٹ کر تجھ کو چاہوں

جسم پر دردۂ زندگی ہے
رُوح کا تبصرہ چاہتا ہوں

جانے کیا کیا فسانے بنیں گے
کوئے جاناں میں کیوں رک گیا ہوں

بات سنتے ہیں دیوار و در بھی
تجھ سے کہنا تو کچھ چاہتا ہوں

لوگ خوش ہیں کہ اٹھا ہے بادل
میں محلّے کے گھر دیکھتا ہوں

(۱۹۷۵ء)

کچھ تو شہرت برہنہ پائی دے

تو بھی الزام بے وفائی دے

سب تو ہیں ایک دوسرے کے رقیب

اپنا چہرہ کسے دکھائی دے

میں نے کی بھی تو ہے خلوص کی بات

کیوں نہ دنیا مجھے بُرائی دے

روح حاصل بھی ہے تلاش بھی ہے

دیکھئے جسم کب رہائی دے

رت چلی تو ہے اک اجالے کی

میرے گھر تک خدا رسائی دے

میرے سینے سے سر لگا کے کبھی

میری سانسوں کو پارسائی دے

بیچ قبروں کے چپ کھڑا ہوں نیاز

کچھ سناؤں جو کچھ سنائی دے

(۱۹۸۰ء)

شیخ ہی تنہا نہ تنہا برہمن بدنام ہے

اصل میں ہر پر تصنّع پیرہن بدنام ہے

آؤ ہم دست طلب پر روک لیں زلف دراز

سنبلوں کی پرورش سے بھی چمن بدنام ہے

لالہ و گل کی چٹک بھی کچھ دلوں پر بار تھی

اتفاقاً صرف کانٹوں کی چبھن بدنام ہے

میں اکیلا شرط بربادی مکمل کر چکا

پھر نہ جانے کیوں محبت کا چلن بدنام ہے

عشق کرنا ہے تو اک معیار رکھو دوستو

روح کی پاکیزگی ڈھونڈو بدن بدنام ہے

کن مہکتے گیسوؤں کی آرزو میں اے نیاز

تیرا نغمہ از کراچی تا ختن بدنام ہے

(۱۹۵۸ء)

بڑھ رہی ہے ابھرتے سویرے کی ضو

اب ابھی راہ پر ہیں ابھی راہ رو

ہیں کہ مجھ سے خفا میری پرچھائیاں

تو کہ تجھ پر فدا جلوۂ نو بہ نو

تجھ میں کس کی مہک تھی کہ نیند اُڑ گئی

تیز رو اے نسیمِ سحر تیز رو

دل دھڑکتا رہا تیرے وعدہ کی شب

تیز کرتا رہا میں چراغوں کی لو

اے نیاز اعتمادِ نظر چاہیئے

آج کی رات گذری تو کل صبح نو

(۱۹۶۸ء)

ہوا کرے جو کہیں شہر میں اجالا ہے
ہمارے گھر تو اندھیرے کا بول بالا ہے

سکوتِ بحر سے اندازہ ہو رہا ہے مجھے
کہ پھر یہاں کوئی طوفان آنے والا ہے

طرب کدوں کے چراغوں کو کیا خبر اس کی
کہ غم کدوں میں اندھیرا ہے یا اجالا ہے

نگاہِ شوق تو تابِ جمال لا نہ سکی
تصوّرات نے اک راستہ نکالا ہے

جو لوگ شورشِ طوفاں سے بچ کے آئے تھے
انھیں سیاستِ ساحل نے مار ڈالا ہے

ہمارے گھر میں پلے ہیں نیازؔ شعر و ادب
وہ اور ہیں جنھیں شعر و ادب نے پالا ہے

(۱۹۷۴ء)

دیکھنا بھی تجھے خیال ہوا
حادثہ یہ بھی حسب حال ہوا

ہم بہت خوش تھے انکی محفل میں
اور پھر جی بہت نڈھال ہوا

کیا خبر تجھ کو تیرے ملنے سے
کتنے زخموں کا اندمال ہوا

یہ نہ ہو جسم رُوح سے بچھڑے
یہ نہ ہو خواب تھا خیال ہوا

کہہ تو دیں اس سے حرف شوق نیاز
اور اُس کو اگر ملال ہوا

(۱۹۷۹ء)

فطرتاً انسان خود آگاہ کم ہے دوستو
غم زدہ ہو تم مجھے اس کا بھی غم ہے دوستو

تم کو اک دن مار ڈالے گا وہ زعم آگہی
جو تمہارا ہی تراشیدہ صنم ہے دوستو

عزّتیں کچھ ماہ انجم ہی سے کیوں منسوب ہیں
دل کو بھا جائے تو پتھر محترم ہے دوستو

میرے خوں سے کیا زمیں کا قرض ادا ہوگا مگر
دشت میں تو آبِ جو بھی مغتنم ہے دوستو

اس سے بڑھکر علم و فن کو کیا سزا دی جائیگی
جہل بھی منجملۂ اہلِ قلم ہے دوستو

کیا کسی کا بھولنا آسان ہے تم ہی بتاؤ
تم کو اپنے دل رباؤں کی قسم ہے دوستو

(۱۹۷۵ء)

نئے جہاں کے بتوں میں ترا بدل نہ ملا
یہ شعر وہ ہیں جنھیں منصبِ غزل نہ ملا

وداعِ شب پہ بھی گھر میں وہی اندھیرا ہے
ابھی تک اے مرے سورج تجھے نکل نہ ملا

ترے ملن کی گھڑی ایک عمر تھی میری
پھر ایک عمر ملی اور ایک پل نہ ملا

کسی پری نے بتایا تو تھا پتہ اپنا
مگر ہمیں وہ طلسمات کا محل نہ ملا

ہزار طرزِ تخاطب مرے خیال میں تھے
تم آ گئے تو کوئی لفظ برمحل نہ ملا

(۱۹۵۹ء)

اب تو یوں بھولی ہوئی اک رہ گذر یاد آئے ہے
شام کو جیسے کوئی خواب سحر یاد آئے ہے

ہم کو کیا ہوتا شکست شاخ گل پر اعتراض
ہاں مگر یوں بھی شکست بال و پر یاد آئے ہے

کتنے ہنگاموں کو دن ڈھلتے بھلا دیتے ہیں لوگ
مجھ کو اک رستہ کا چہرہ رات بھر یاد آئے ہے

دیکھ کر صحرا کو گھر کی یاد آتی تھی کبھی
اب تو اپنے گھر میں رہ کر اپنا گھر یاد آئے ہے

مل گئی منزل سفر انجام کو پہونچا نیاز
اب یہ صورت ہے کہ آغاز سفر یاد آئے ہے

(۱۹۷۷ء)

چند چہرے مثالی بھی ہیں

ان میں سرکار عالی بھی ہیں

شاخ شاخ آشیاں ہی نہیں

بجلیاں ڈالی ڈالی بھی ہیں

دوستو دل میں جھانکا کرو

صورتیں بھولی بھالی بھی ہیں

حاتم حسن بن کر نہ چل

راستہ میں سوالی بھی ہیں

ہم کسے اپنا قاتل کہیں

کچھ صنم تو خیالی بھی ہیں

ہر تمنا برآئی نیاز

اور پھر ہاتھ خالی بھی ہیں

(۱۹۷۹ء)

جو ہار ترے گلے کے ہوں گے
وہ ہاتھ بھی چومنے کے ہوں گے

باہر مرا ہوگا منتظر کون
پتھر مرے راستے کے ہوں گے

نیندوں کا طلسم ٹوٹنے دو
دن رات مقابلے کے ہوں گے

تم کیا ہو مری نظر سے پوچھو
آئینے تو دیکھنے کے ہوں گے

ہم گرد و غبار ہوں گے لیکن
بڑھتے ہوئے قافلے کے ہوں گے

دشمن بھی ہمارے ساتھ رویا
دکھ ایک ہی سلسلے کے ہوں گے

(۱۹۸۰ء)

کر رہی تھی نظر تقابل سا
کوئی بھی گل نہ تھا مرے گل سا

دھوپ کی فکر سایہ داروں کو
مجھ کو اکثر رہا تامّل سا

رُوح بھی کچھ گریز پا ہی رہی
جسم نے بھی کیا تغافل سا

پیارؔ اس وقت کی حویلی میں
ہے چراغ سحر کہ ہے گل سا

شورِ ماضی بھلا گیا ہے نیازؔ
ایک لہجہ نوائے بلبل سا

(۱۹۷۷ء)

وار ہم پہ کر تو کر گئی خوشبو
دوستو پھر کدھر گئی خوشبو

ہم دل و رُوح میں بسا لیتے
پھول میں کیوں اُتر گئی خوشبو

جب کھلے مقتلوں کے دروازے
ہم کو شرمندہ کر گئی خوشبو

کب سے یہ شہر سج رہا تھا مگر
ایک پل میں گذر گئی خوشبو

تیرے گیسو تصورات میں تھے
سارے گھر میں بکھر گئی خوشبو

گھر کا رشتہ عظیم ہوتا ہے
گل کو چھوڑا تو مر گئی خوشبو

کچھ غزال ختن ہنوز نیاز
رقص میں ہیں مگر گئی خوشبو

(۱۹۷۸ء)

گھوم لئے گلی گلی
گھر کی اُداسیاں بھلی
سو گئی انجمن تو کیا
شمع تو رات بھر جلی
شہر تو بس گئے مگر
رسم وفا کہاں چلی
ظرف نہ تھا بکھر گیا
پھول پہ ہنس پڑی کلی
اب جو چلی کوئی سموم
باغ سے فصل گل چلی
دل بھی بجھا بجھا نیازؔ
عمر بھی اب ڈھلی ڈھلی

(۱۹۸۰ء)

بیتابیٔ دل اگر جنوں ہے
تجھ کو مرا انتظار کیوں ہے
تجھ سے تجھے چھین تو نہ لوں گا
رک جا کہ مجھے ذرا سکوں ہے

تو ہی مرے پیار کا صلہ دے
منفی مری سوچ ہے تو کیوں ہے
کچھ میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں
کچھ تیری گلی بھی پُر سکوں ہے
تھی مجھ کو کبھی خود اپنی چاہت
تو آنکھ اٹھا تو پھر کہوں ہے

(۱۹۷۷ء)

نظمیں

میرا فن تھا کہ میری رسوائی
آگ دل کی قلم نے برسائی

صلۂ شہید کیا ہے.......

۸ر جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں شہید ہونے والے طلبا کے نام

نہ جانے کتنی حسین روحیں وجود پانے سے رہ گئی ہیں
نہ جانے کتنی عظیم نسلیں لہو کی صورت میں بہہ گئی ہیں
یہی لہو تھا
کہ جس لہو نے رخ عروس وطن نکھارا
کبھی بنائی بھگت کی صورت کبھی بہادر کا روپ دھارا
یہی لہو پھر افق سے آج اپنے ساتھیوں کو پکارتا ہے

حزیں نہ ہو پیشرو عزیزد !

ابھی یہاں ہیں تمہارے ساتھی

تمہارے مونس تمہارے ہمدم

کہ جنکے سینوں میں ضوفشاں ہیں

تمہاری یادوں کے دیپ جو ظلمتوں میں رستہ دکھا رہے ہیں

تمہارے ہمدم اسی فضا میں حیات کے گیت گا رہے ہیں

اجل سے آنکھیں ملا رہے ہیں

جو تم نے روشن کئے تھے ہم وہ چراغ پھر سے جلا رہے ہیں

حزیں نہ ہو پیشرو عزیز و تمہارے پیچھے ہم آ رہے ہیں

۱۹۵۵ء کی رخصت پر

سنہ ۱۹۵۵ء اردو ادب پر بڑا بھاری گذرا
سعادت حسن منٹو، بیخود دہلوی، خواجہ حسن نظامی،
وتاتریہ کیفی، چراغ حسن حسرت
اور سہیل کے بعد ترقی پسند ادب
کا جواں سال علمبردار اسرار الحق
مجاز بھی چل بسا!

تیرے مونس تیرے ہمدم یاد رکھیں گے تجھے
رخصت اے سال رواں ہم یاد رکھیں گے تجھے

کسقدر مسرور تھے ہم تیرے استقبال پر
فکر ماضی مطمئن تھی ابتدائے حال پر
کتنے گھر اس آرزو میں تھے بہاریں آئینگی
تھا خیال اس سال غم کی بدلیاں چھٹ جائینگی
کتنی حوریں مسکرائی تھیں نیا دن آگیا
خود جہاں آنچل سرک جاتے ہیں وہ سن آگیا
کتنے فاقہ مست تیری آس پر سرشار تھے
بھوک میں بھی تیرے استقبال کو تیار تھے
کتنے فنکاروں نے سوچا تھا بڑھے گی فن کی قدر
تن کی عزت کرنے والے اب کریں گے من کی قدر

لیکن اے سال رواں اے عشرت نو کے سراب
اے سکوں دشمن جنوں انگیز بے تعبیر خواب

تجھ سے وابستہ تمنا آج تک ناکام ہے
آج بھی ماضی کی تخریبی روایت عام ہے

کیا خبر تھی فطرتاً امروز روز و وشس تھا
تیرے پردہ میں گذشتہ دور بھی روپوش تھا

زندگی کیا آرزوئے زندگی بھی چھین لی
اے ستمگر تو نے مصنوعی ہنسی بھی چھین لی

سب سے بڑھکر علم و فن پر ظلم ڈھانے تھے تجھے
یعنی بیماروں پہ خنجر آزمانے تھے تجھے

ختم تیرے دور میں منٹو کا افسانہ ہوا
نذر تیری حضرت بیخود سا فرزانہ ہوا

تو نے بخشا انتقال خواجہ کیفی کا داغ
تیرے جھونکے نے بجھایا محفل فن کا چراغ

تیرے ساتھ آیا تھا اے ظالم غم مرگ سہیل
لوٹتی تھی خاک پر اردو دم مرگ سہیل

نقش دل پر جلتے جاتے یہ ستم بھی کر گیا
لٹ گئی اردو مجاز نغز گو بھی مر گیا

جس کے نغموں نے نیا آہنگ پایا وہ مجاز
اہل دل کو جس نے ساز نو سنایا وہ مجاز

تنگ دستی میں بھی جو ہنستے ہوئے زندہ رہا
زندگی کی ظلمتوں میں بھی جو تابندہ رہا

خوب ہیں تیرے چلن اے گردش چرخ کہن
اور تیری نذر کیا کرتی ہماری انجمن

تیرے موتس تیرے ہمدم یاد رکھیں گے تجھے
رخصت اے سال رواں ہم یاد رکھیں گے تجھے

شیڈرک کی موت پر

کوریا کی جنگ شروع ہونے
کے دوسرے ہی دن جو امریکی
سپاہی مارے گئے ان میں
پرائیوٹ کنتھ شیڈرک
کا پہلا نمبر تھا جس نے
۱۹ سال کی ہنستی بولتی
زندگی کو نذر اجل کردیا

سچ ہے اے شیڈرک کہ جنگ کی تیغ
آدمی کا سہاگ ہوتی ہے
لیکن اے نوجوان راہ حیات
رزم گاہوں میں آگ ہوتی ہے

تو نے اب تک فضائے عشرت میں
شادمانی کا راگ گایا تھا
آگ اور خون کی فضاؤں میں
یہ بھی مانا کہ تو خود آیا تھا

یہ حقیقت بھی تو نے سوچی تھی
اپنے جذبات کی روانی میں
"موت اک مستقل حیات سہی
پھر بھی اچھی نہیں جوانی میں"

اجنبی

دل کے ویرانہ خاموشش میں اک عمر کے بعد
آج یہ کون دبے پاؤں چلا آتا ہے
اس خرابہ میں بھی کیا کوئی پری اتری ہے
دل کی دھڑکن ہے کہ پائل کی صدا ہے چھم چھم
جیسے بھیروں کہیں بربط سا بجائے کوئی
کس کے قدموں کی یہ آہٹ کا گماں ہے ہر دم
کس کے پیراہن رنگیں کی بہاروں کے طفیل
دل میں ہر لحظہ نئے پھول کھلے جاتے ہیں
جانے کس دست حنائی کا تصوّر ہے کہ آج
چاک خود جیب و گریباں کے سلے جاتے ہیں

کون انگڑائی سی لیتا ہے یہ صحن دل میں

رگ جاں ٹوٹ کے میخانہ بنی جاتی ہے

کس کی پائل کی صدا گھول رہی ہے امرت

تلخی زیست اک افسانہ بنی جاتی ہے

کس کی خوشبوئے بدن ہے کہ مرے ذہن پہ آج

ایک جادو کی طرح چھائے چلی جاتی ہے

کس کی دوشیزگی جسم کی گرمی ہے کہ جو

میرے احساس کو گرمائے چلی جاتی ہے

سوچتا ہوں کہ کسی پیکر نازک کے لئے

دل کی اجڑی ہوئی وادی کو سجا دوں پہلے

اک مدّت سے نہاں خانۂ دل ہے تاریک

شمع نوخیز امیدوں کی جلا دوں پہلے

لیکن اب شمع جلانے کی ضرورت بھی نہیں

چاند آکاش سے سینہ میں ڈھلا آتا ہے

دل کے ویرانہ خاموش میں اک عمر کے بعد

اک انجان دبے پاؤں چلا آتا ہے

سوچتا ہوں کہ کسی پیکر نازک کے لئے

دل کی اجڑی ہوئی وادی کو سجا دوں پہلے

اک مدّت سے نہاں خانۂ دل ہے تاریک

شمع نوخیز امیدوں کی جلا دوں پہلے

لیکن اب شمع جلانے کی ضرورت بھی نہیں

چاند آکاش سے سینہ میں ڈھلا آتا ہے

دل کے ویرانہ خاموش میں اک عمر کے بعد

اک انجان دبے پاؤں چلا آتا ہے

اندھیرا اُجَالا

کل مرے غم کدہ کی سیہ پوشیاں

اور خاموشیاں

دھڑکنیں میرے دل کی بڑھاتی رہیں

آرزوؤں کے طوفاں اٹھاتی رہیں

ذہن پر ان گنت دیپ سے جل اٹھے

شوق و امید کے

نور سا بزم ہستی پہ چھانے لگا

آنے والا مجھے یاد آنے لگا

یاد آنے لگا چہرۂ شرمگیں

مثل ماہ مُبیں

جس سے روشن ستاروں کو شرم آئے ہے

صبح جس کے جلو کی قسم کھائے ہے

یاد آنے لگے گیسوئے تا کمر

امتحان نظر

جن سے کھیلیں گی فن کار کی انگلیاں

جن کو سلجھائیں گی پیار کی انگلیاں

مسکراتی نگاہوں میں معصومیت

جس کی محبوبیت

شہر خوباں میں سرمایہ ناز ہو

خود بھی حیران سا آئینہ ساز ہو

اُف وہ آواز میں شعریت کا فسوں

کس قدر پر سکوں

جاگتے ہیں کوئی جیسے سونے لگے
ساز دل خود ہم آواز ہونے لگے
شمع بزم تصور کی یہ روشنی
یہ فضا نور کی
کروٹیں یوں ہی پیہم بدلتی رہی
اور شب بھی بدستور ڈھلتی رہی
دفعتاً اک بھکاری کی پژمردہ لے
ایک افسردہ لے
مانعِ فکر جادو اثر ہو گئی
دیپ بجھنے لگے اور سحر ہو گئی

نئے چاند سے

جب سے تجھکو دیکھا ہے
بار ہا یہ سوچا ہے
اس طرح بھی سینے میں چاہتیں سلگتی ہیں
چاہتیں بھی انسان کا روپ دھار سکتی ہیں
جب سے تجھکو دیکھا ہے
رنگ بنکے ماضی کا نقش نقش ابھر آیا
گمشدہ محبت کی ساری تلخیاں لے کر
گھومتا پھرا برسوں
میں سکون رفتہ کو
ڈھونڈتا پھرا برسوں

وہ نہ تھا تو سوچا تھا دل بہل ہی جائے گا
اجنبی فضاؤں میں دم نکل ہی جائے گا
اتفاق کا لمحہ
اس طرح بھی ملتا ہے
اک حسیں دوراہہ پر
سر بسر وہی صورت
ہو بہو وہی نقشہ
جیسے ڈھونڈنے مجھکو وہ یہاں تک آپہونچا
دل کا راز جانے کیوں پھر زباں تک آپہونچا
جب سے تجھکو دیکھا ہے
واہمہ گذرتا ہے

زلف عنبریں جیسے میں نے خود سنواری ہے
میں نے تیرے چہرے میں یہ دھنک اتاری ہے
میں نے اس جبیں کو بھی بار بار چوما ہے

سوچتا تو ہوں اکثر
کاش واہمہ کو میں
واقعہ بنا سکتا
کاش تجھکو پا سکتا

عمر بھر نہ کھونے کو
میری رفعتوں کے روپ میری عظمتوں کے چاند
اب جو تو چھپا مجھ سے کچھ نظر نہ آئے گا
صبح کے سمندر میں خواب ڈوب جائیگا

کیوں پسند آئی ہے تو مجھ کو مری جان نہ پوچھ
دے گیا ہے مجھے جینے کی تمنا ترا پیار
بن گیا ہے دلِ بے تاب کی دھڑکن ترا روپ
آتشِ گل کا بھڑکتا ہوا شعلہ ترا حسن
مئے رنگیں کا برستا ہوا ساون ترا روپ
سنگِ مرمر کا تراشا ہوا پیکر ترا جسم
باغِ کشمیر کا اٹھتا ہوا جوبن ترا روپ

ماحصل

چاندنی رات میں بہتی ہوئی چاندی ترا انگ

صبح کے وقت دمکتا ہوا کندن ترا روپ

جس میں طوفان پنپتے ہوں وہ ساگر تری گات

جس میں آشائیں مہکتی ہوں وہ گلشن ترا روپ

میری سانسوں میں بھی تو ہے مری غزلوں میں بھی تو

بن گیا ہے مری گوری مرا جیون ترا روپ

مجھ کو جینے کا ہے کیوں اس قدر ارمان نہ پوچھ

انتظار

اپنے اظہارِ شوق سے پہلے
آ کے ڈیوڑھی کی جالیوں پہ کبھی
تو مرا انتظار کرتی تھی
تیری آنکھیں کبھی سناتی تھیں
تیری آنکھوں کے رت جگے مجھکو

میں جو لکھتا تھا تیرے نام کے حرف
تو کتابوں پہ ڈھونڈ لیتی تھی
اپنے اظہارِ شوق سے پہلے

اور جس دن نہ مل سکوں تجھ سے
تیرا پیغام یوں پہونچتا تھا
جیسے تو بھی اک اضطراب میں ہے
عشق کے لیے زیاں عذاب میں ہے

میری غزلوں کی چاہتیں تجھے
میری غزلوں پہ میری روح کے ساتھ
جھوم اٹھتی تھیں خلوتیں تیری
لیکن ایسے کہ کوئی دیکھ نہ لے

آج اے جان زندگی و خیال
منتظر ہوں قدم قدم تیرا
سارے جیون کے رت جگے لے کر

اب تو میری کتابِ ہستی میں

ہر ورق پر لکھا ہے ترا نام

میرے کھوئے ہوئے وجود کا ذکر

بن گیا ہے مری غزل کا مزاج

اور تو جانے کب ملے گی مجھے!

سفر

اٹھ اے مری ندیم اٹھ سفر بہت قریب ہے
وہ پو پھٹی گجر بجا سحر بہت قریب ہے
نو شاعرا! طلب سفر کا اہتمام کر
نئے شعور کی نئی لگن کا احترام کر
یہ زندگی بھی کیا ہے جسمیں کیف زندگی نہیں
نہیں نہیں مجھے کسی بہار کی خوشی نہیں
دکھی تڑپ تڑپ کے خون رو رہا ہے آج بھی
جہاں میں اہتمام جنگ ہو رہا ہے آج بھی
ہنوز یاد ہیں جہاں کو ان گنت تباہیاں
کہ پھر افق پہ چھا رہی ہیں جنگ کی سیاہیاں

ضعیف باپ کا سر بھوک سے نڈھال ہے
لٹی ہوئی حیات کو سکون تک محال ہے
خلا میں ڈھونڈتی ہے کچھ ستم زدہ نحیف ماں
مچل رہے ہیں خشک لب تڑپ رہی ہے داستاں
تفکرات مستقل سے تھک گیا ہے نوجواں
فرار چاہتا ہے اس کی زندگی کا کارواں
نئی سہاگنیں اداس ہیں اسی خیال سے
کہ ان کے آنچلوں سے پھر علم بنیں گے جنگ کے
حسیں حسیں نئے گھر پھر آج ٹوٹ جائیں گے
تڑپ کے شیر خوار طفل ماں سے چھوٹ جائیں گے

ندیم ! وقت ہے ابھی وہ جا رہا ہے کارواں
نئے سکوں نئی خوشی کی کھوج میں رواں دواں

تیاگ دے پریم کو یہ وقت کی پکار ہے

ہمارے کارواں کو پھر ہمارا انتظار ہے

پھر بینگے کو یہ کو کہ صرف حق ہی فتح مند ہو

جہاں میں پھر صدائے دین مصطفیٰؐ بلند ہو

پھریں گے دیس دیس ہم کہ انتشار دور ہو

جلائیں گے وہ دیپ جن سے شانتی کا نور ہو

حیات کے لئے نیا نکھار لے کے آئیں گے

ہمیں یقیں ہے امن کی بہار لے کے آئیں گے

اٹھ اے مری ندیم اُٹھ ....

دو جنازے

شکیب جلالی کی وفات پر
ظفر لودھی کے نام۔

ظفرؔ! یہ کیا مذاق ہے یہ خط ہے یا مذاق ہے
کہ کل شکیب مر گیا
ظفرؔ! ہنسی کے دن گئے
وہ سن گیا مذاق کا وہ دل لگی کے دن گئے
کہ تو، شکیب اور میں
وہاں ہیں اب
جہاں سروں پہ چند تار نقرئی چمک اٹھیں
گذشتہ خط میں تو نے لکھ دیا تھا وہ علیل ہے
جواب یہ دیا تھا اس نے میرے خط کا پھر مجھے
ستم ظریف ہے ظفرؔ
اُدھر تجھے یہ لکھ دیا کہ میں بہت علیل ہوں
اِدھر مجھے لکھا ہے کچھ نیازؔ کی خبر ملی
سنا یہ ہے بہت دنوں سے صاحبِ فراش ہے

مگر ظفرؔ کی بات بھی غلط نہیں ہے
ان دنوں
نیازؔ اور شکیبؔ کیا معاشرہ علیل ہے
غرض تری ہنسی پہ ہنس دئے تھے ہم
مگر یہ کیا مذاق ہے
یہ کون سا مذاق ہے
کہ کل شکیبؔ مر گیا
ستم ظریف رحم کر!
مگر نہیں
ظفرؔ نہیں
یہ صبر آزما خبر یہی خبر
ابھی ابھی کسی نے فون پر سنائی ہے مجھے

ظفؔر یہ کیا ہوا ظفؔر ؟
یہ میری صرف ایک چیپ بس ایک چیپ !
یہ ایک سطر تیرے خط کی صرف ایک سطر ہی !
کہ ۔ کل شکیبؔ مر گیا
ظفؔر مری طرح سے غم زدہ ظفؔر !
مرے عزیز دوست تیری شوخیوں کا واسطہ
کسی طرح
اسی طرح کی اک خبر شکیبؔ کو بھی بھیج دے
کہ ۔ کل نیازؔ مر گیا !!